فہرست

لمعات

اسلامیات کے اولین درجات کی نصابی کتب میں نظرثانی کی ضرورت	ڈاکٹر انعام الحق، اسلام آباد	3
دروس القرآن	غلام احمد پرویز	10
عبادت واطاعت اور الٰہ کا مفہوم	غلام باری، مانچسٹر	33
حکمت کی باتیں	ڈاکٹر انعام الحق، اسلام آباد	37
ہر قرآنی قانون کی اطاعت عبادت ہے اور ہر عبادت قانون کا درجہ رکھتی ہے۔	خواجہ ازہر عباس، فاضل درسِ نظامی	44
نماز کی اہمیت	غلام احمد پرویز	50

ENGLISH SECTION

POLITICAL VALUE SYSTEM

(A chapter from an unpublished book "Quranic Value System")

By Maj Gen (Rtd) Ihsan-ul-Haq 1

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

﴿ڈاکٹر انعام الحق﴾

لمعات

اسلامیات کے اولین درجات کی نصابی کتب میں نظر ثانی کی ضرورت

(۱) اسلامیات برائے جماعت چہارم کے صفحہ نمبر ۱۵ پر درج ہے کہ:

ہمارے پیارے رسول ﷺ نے فرمایا ہے کہ جس کسی نے اللہ تعالیٰ کو خوش کرنے کے لئے مسجد بنائی، اللہ تعالیٰ اس کے لئے جنت میں ایک گھر بنائے گا۔

اس سے بچوں کے ذہن میں یہ عقیدہ پیدا ہونے کا امکان ہے کہ کوئی بھی شخص (خواہ مومن ہو یا کافر) دولت جمع کر کے (خواہ کسی طریقے سے بھی ہو) اس میں کچھ رقم خرچ کر کے خدا کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے مسجد تعمیر کرا دے وہ جنت میں داخل ہو کر ایک بنے بنائے گھر کا مستحق ہو سکتا ہے۔ لہٰذا اس کی وضاحت ضروری ہو کہ جنت میں داخلہ اسلام کے پورے پورے داخلہ سے مشروط ہے۔ یہ اضافی سہولت صرف مومنین کو دستیاب ہو سکتی ہے۔

(۲) صفحہ ۱۳ میں ایک عنوان کے تحت بندوں پر اللہ تعالیٰ کے حقوق کی فہرست دی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ذات مکمل طور پر بے نیاز (الصمد) ہے۔ قرآن میں صرف ایک مرتبہ اللہ تعالیٰ کے حق کا ذکر ہے۔ وہ بھی اس سلسلے میں کہ زمین میں فصل کاٹنے کے بعد اللہ کا حق اس کو لوٹا دو اور ساتھ اس کی بھی تصریح کر دی گئی ہے کہ یہ حق بھوکوں کو کھانا کھلانے (کا انتظام کرنے) سے پورا ہوتا ہے۔ قرآن کی تعلیم سے سمجھ میں یہی آتا ہے کہ خدا کی طرف سے بندوں کو جو بھی ہدایت دی گئی ہے اس میں انہی بندوں کا فائدہ ہے۔ یہ بنیادی بات ہے اور وضاحت کی متقاضی ہے کہ اسے بچوں کے ذہن میں آغاز ہی میں بٹھا دیا جائے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات بندوں کی محتاج نہیں ہے۔ اس کی اطاعت سے خود انسان کی ذات کی نشوونما مقصود ہے نہ کہ حق اللہ تعالیٰ کی ادائیگی۔

اگر یہ وضاحت ذہن میں رہے تو صفحہ ۲۰ میں یہ بات درج کرنے کی ضرورت محسوس نہ رہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے حقوق اپنے جن بندوں کے لئے چاہیں گے معاف فرما دیں گے۔

(۳) اسی صفحہ نمبر ۱۳ میں انسان کے نیک اور گناہ کے اعمال دوسروں کو منتقل ہونے کی بات کی گئی ہے۔ حالانکہ ان کی کسی بھی حالت میں منتقلی کا تصور قرآنی تعلیم سے متضاد ہے۔

وَاتَّقُواْ يَوْماً لَّا تَجْزِىْ نَفْسٌ عَن نَّفْسٍ شَيْئاً وَلاَ يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ وَلاَ يُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ وَلاَ هُمْ يُنصَرُونَ O (۲/۴۸)۔

اور ڈرو اس دن سے کہ کام نہ آئے کوئی شخص کسی کے کچھ بھی اور قبول نہ ہو اس کی طرف سے سفارش اور نہ لیا جائے اس سے بدلہ اور نہ ان کی مدد پہنچے۔

اسی نوعیت کا پیغام ہمیں قرآن سے دوسری جگہوں میں بھی متعدد دفعہ ملتا ہے۔

ان کی موجودگی میں اللہ تعالیٰ سے منسوب رسولﷺ کی زبان سے اس روایت کے درج کرنے میں زیادہ احتیاط کی ضرورت ہے کیونکہ رسول اکرمﷺ سے منسوب قرآنی تعلیم کے خلاف روایت کو قبول ہونے کی سند حاصل نہیں ہے۔

(۴) صفحہ ۲۳۔۲۲ میں نزول وحی کے باب میں درج ہے کہ آپ کا دل اس بوجھ کے ڈر سے کانپ گیا۔ آپ نے گھر آ کر اپنی بیوی حضرت خدیجہؓ سے کہا: مجھے چادر اوڑھا دو۔ حضرت خدیجہؓ کے چچازاد عیسائی عالم ورقہ بن نوفل نے بتایا کہ یہ تو وہی ناموس (فرشتہ) ہے' جسے اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام پر نازل فرمایا تھا۔

یہ لاعلمی اور ڈر' قرآن کی تعلیم کے خلاف رسول سے منسوب کر کے اس کے یقین کامل سے نفی کا تاثر دیتا ہے۔

اس ضمن میں قرآن کا ارشاد ہے کہ:

مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَأَى O (۵۳/۱۱)۔

(رسول کو یقین تھا کہ) جھوٹ نہیں کہا رسول کے دل نے جو (وحی کا طریق عمل) دیکھا۔

تفسیر عثمانی میں اس کی وضاحت کی گئی ہے کہ رسول کو خود اطمینان نہ ہو تو دوسروں کو کہاں سے دستیاب ہوسکتا ہے (چاہے وہ ورقہ بن نوفل ہی کیوں نہ ہو)۔ نبی کی آنکھیں جو کچھ دیکھتی ہیں' اس کا دل اس کی تصدیق کرتا ہے اور وہ سب سے پہلے اس حکم کے آگے سر جھکاتا ہے۔

أَنَاْ أَوَّلُ الْمُسْلِمِيْن (۶/۱۶۳)۔

سب سے پہلے میں (رسولؐ) نے خود خدا کے حکم کے سامنے سر تسلیم خم کیا ہے۔

(۵) صفحہ ۳۴ میں طائف والوں کی بدسلوکی کے ضمن میں درج ہے کہ:

ایک مقام پر پہاڑوں کا فرشتہ جبرئیل علیہ السلام کے ساتھ حاضر ہوا اور کہا کہ آپ (رسولؐ) حکم دیں تو میں ان لوگوں کو دو پہاڑوں کے درمیان پیس دوں۔

قرآن میں ملائکہ (فرشتوں) کے فرائض منصبی کا ذکر کیا گیا ہے جن پر ہمیں ایمان لانے کو کہا گیا ہے۔ اس ضمن میں قرآن سے ملائکہ کے ضمن میں ہمیں پہاڑوں کے فرشتہ کا ذکر اور لوگوں کو پہاڑوں کے درمیان پیسنے کے فرائض نہیں ملتے۔ ہماری

گذارش یہ ہے کہ ان کے متعلق جن پر ہمیں ایمان بالغیب لانے کو کہا گیا ہو' وہی نظریات سامنے لانے چاہئیں' جن کی تعلیم ہمیں وحی کے ذریعے حاصل ہوتی ہو۔

(۶) صفحہ ۳۶ میں معراج النبیؐ کے تحت درج ہے کہ:

معراج کا واقعہ نبوت کے دسویں سال رجب کے مہینے کی ستائیسویں رات کو پیش آیا۔

یہ یقیناً احسن بات ہے کہ کسی بات کا ذکر حتمی اور محکم انداز سے کیا جائے۔ اس واقعہ میں البتہ ایک ہی نوعیت کے مستند مآخذ سے مختلف روایات ملتی ہیں۔ ان میں سال' مہینے اور دن اور راوی' ہر ایک کے بارے میں تضاد پایا جاتا ہے۔ تضاد کو رفع کرنے کے لئے ایک قانونی اتھارٹی کی موجودگی لازم ہے' جس کا حتمی فیصلہ سب پر لاگو ہو سکے۔ اس کی غیر موجودگی میں ان کا اعلان مزید تنازعات کا باعث ہونے کا امکان رکھتا ہے۔ اس بات کا البتہ تاریخ کے علم سے تعلق ہے لہٰذا یہ کہنا موزوں ہو گا کہ اکثریت کا یہ خیال ہے۔

(۷) صفحہ ۵۱۔۴۰ میں باب چہارم میں اخلاق و آداب کے تحت ایمانداری' خدمت خلق' سادگی جیسے عنوانات کے ذریعے نصائح شامل کئے گئے ہیں۔ ان میں بیشتر قرآنی آیات کا مفہوم لئے ہوئے ہیں۔ ہمارے خیال میں اگر یہاں قرآن کی متعلقہ آیات کو بھی پہلے سامنے لایا جاتا تو اس سے قرآن کی عظمت اور اہمیت کا بچوں میں زیادہ احساس پیدا ہوتا۔

(۸) اسلامیات برائے جماعت پنجم کے صفحہ نمبر ۱۱ پر درج ہے کہ:

(صحابہ کرامؓ) ہر بات میں چاہے اس کا تعلق دین سے ہو یا دنیا سے' رسول اکرم ﷺ کے مبارک طریقے کے مطابق عمل کرتے۔

دین کے معاملے میں تو رسول خود وحی خداوندی کے مطابق فیصلے دیتے تھے' اس لئے اس میں کسی غلطی کا امکان نہیں تھا۔ بعض دنیاوی معاملات میں جہاں رسول ﷺ نے اپنی فہم کے مطابق فیصلے دیئے' وہاں انہوں نے صحابہؓ کو اجازت دی تھی کہ اگر ان میں (جیسے کھجور کے بیج کا معاملہ تھا) صحابہؓ کو بہتر علم و تجربہ ہو' تو وہ بہتر جاننے کی بنا پر ان سے اختلاف کر سکتے ہیں۔ لہٰذا تاریخ یہ بھی بتاتی ہے کہ بعض صحابہؓ اور خصوصی طور پر حضرت عمرؓ اس اجازت سے فائدہ اٹھایا کرتے تھے۔ اس سے رسول ﷺ کی شان میں کمی واقع ہونے کا امکان نہیں ہوتا جیسا کہ ہمارے بعض مستند علماء کا خیال ہے۔ لہٰذا یہاں دنیاوی معاملات کو شامل کرنا' خود رسول کی تعلیم کے خلاف ہے۔

(۹) صفحہ نمبر ۱۵ میں درج ہے کہ ''سید الایام'' یعنی دنوں کا سردار ہونے کی وجہ سے مسلمان جب صحیح طور پر نمازِ جمعہ ادا کرتا ہے' تو اس کے ہفتہ بھر کے تمام چھوٹے گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔

قرآن سے ہمیں ہدایت ملتی ہے کہ ہمیں احتیاط کا دامن نہ چھوڑتے ہوئے' دین میں غلو کا مرتکب نہیں ہونا چاہئے۔

اس لئے ہمارے خیال میں جمعہ کے دن کو دوسروں کی پیروی میں دینی مسلک نہیں بنانا چاہئے۔ تمام دن اللہ ہی کے قانون فطرت کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ ان سب کا فریضہ چاند اور سورج کی گردش سے دنوں کا حساب رکھنا ہوتا ہے۔ جہاں تک سَیِّئات کے معاف ہونے کا تعلق ہے تو وہ صرف حسنات کے اعمال کا پلڑا بھاری ہونے کی وجہ سے ممکن الحصول ہے۔

إِنَّ الْحَسَنَاتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّئَاتِ (۱۱/۱۱۴)۔

بے شک حسنات دور کرتی ہیں سَیِّئات کو۔

(۱۰) اسی غلو میں مرتکب ہونے کی وجہ سے ص۲۲ میں درج ہے کہ:

(لیلۃ القدر کی) اس رات کی عبادت کا اجر ایک ہزار مہینے کی عبادت سے بھی زیادہ ہے۔

جہاں تک لیلۃ القدر کی اہمیت جتلانا مقصود ہے وہ اپنی جگہ نہایت مستحسن بات ہے لیکن ابھی تک کسی ملک میں اوسط عمر بھی ایک ہزار مہینے تک کسی فرد کی بتائی نہیں جاتی۔ اس لئے قرآن کی ایک ہزار رات کی' وحی پانے کی نسبت سے' فضیلت حاصل کرنے کی بات کو کسی فرد کی عبادت سے منسلک کرنا موزوں نہیں ہے۔

(۱۱) صفحہ نمبر ۳۱ میں درج ہے کہ:

(غزوہ بدر میں) کفار کے قیدیوں میں سے بعض کو احسان کے طور پر چھوڑ دیا گیا۔ جو باقی بچے ان کے متعلق طے ہوا کہ یا تو فدیہ دے کر آزادی حاصل کر لیں یا دس دس مسلمان بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھا دیں۔

ایام جاہلیت میں غلاموں اور لونڈیوں کا اصل سرچشمہ جنگ کے قیدی ہی تھے۔ لیکن یہاں واضح کر دیا گیا ہے کہ غزوہ بدر میں غلامی کی گنجائش نہ چھوڑ کر' اس کا چور دروازہ ختم کر دیا گیا ہے۔ خود یہ فیصلہ بھی قرآن کی ہدایت لئے ہوئے ہے۔

فَإِذا لَقِيتُمُ الَّذِينَ كَفَرُوا فَضَرْبَ الرِّقَابِ حَتَّى إِذَا أَثْخَنتُمُوهُمْ فَشُدُّوا الْوَثَاقَ فَإِمَّا مَنًّا بَعْدُ وَإِمَّا فِدَاء حَتَّى تَضَعَ الْحَرْبُ أَوْزَارَهَا ..... (۴/۴۷)۔

سو جب تم مقابل ہو کافروں کے تو مارو گردنیں یہاں تک کہ جب خوب قتل کر چکو ان کو مضبوط باندھ لو قید پھر یا احسان کرو اور یا معاوضہ لو (قیدیوں کو چھوڑنے کا) جب تک کہ رکھ دے لڑائی اپنے ہتھیار۔

(۱۲) اذان کی ابتدا کے بارے میں اسلامیات برائے جماعت ششم کے صفحہ نمبر ۹ میں درج ہے کہ:

اللہ تعالیٰ نے صحابہ کرامؓ کو خواب میں اذان کے کلمات اور طریقہ سکھا دیا۔ جب حضورﷺ کے علم میں یہ بات لائی گئی تو پتا چلا کہ آپ کو بھی بذریعہ وحی اذان کے یہی کلمات بتائے گئے ہیں۔

مزید بحث میں پڑے بغیر' ہم قرآن سے ہدایت پاتے ہیں کہ خدا نے جو بات (وحی) کہنی تھی' وہ سب کی سب

قرآن مجید میں محفوظ کر دی گئی ہے۔ لہٰذا قرآن کے علاوہ دوسرے طریق سے وحی کا بیان' قرآن کی تعلیم کے خلاف ہے۔ لہٰذا اذان کے الفاظ کو اللہ تعالیٰ یا وحی سے منسوب کرنا' قرآن میں اللہ کے تمام کلمات کے درج ہونے کے دعویٰ کے خلاف جاتا ہے۔

(۱۳) صفحہ نمبر ۲۲ میں مسجد قبا کے تحت درج ہے کہ:

اس مسجد میں دو رکعت نفل ادا کرنے کا ثواب ایک عمرے کے برابر ہے۔

یہاں بھی ہم یہی گذارش کریں گے کہ اس سے مسجد قبا کی اہمیت تو بڑھ جاتی ہے لیکن عمرے کی حیثیت میں کمی کا باعث بننے کا خدشہ رہتا ہے۔

(۱۴) صفحہ نمبر ۳۷ میں رسول ﷺ کی طرف سے منسوب درج ہے کہ:

آپ ﷺ نے جمعہ کے روز غسل کرنے کی تلقین فرمائی ہے۔

ہم سمجھتے ہیں کہ رسول ﷺ نے ہر روز غسل کرنے کی تلقین فرمائی ہوگی' البتہ یہ کہنا مناسب ہوگا کہ خصوصی طور پر جمعہ کے روز غسل کرنے کی تلقین فرمائی ہے۔

(۱۵) حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بیان میں صفحات ۶۳۔۶۲ میں یوں درج کیا گیا ہے۔

(بدلہ میں) حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اس آگ میں ڈال دیا۔ اللہ تعالیٰ کے حکم سے وہ آگ ٹھنڈی اور سلامتی والی بن گئی اور حضرت ابراہیمؑ کو کوئی نقصان نہ پہنچا۔ اس معجزے کو دیکھ کر بھی وہ بدنصیب قوم ایمان نہ لائی۔

حضرت ابراہیمؑ کے آگ میں ڈالنے کے واقعہ میں قرآن میں درج ذیل آیات ملتی ہیں۔

قَالُوا ابْنُوا لَهُ بُنْيَاناً فَأَلْقُوهُ فِي الْجَحِيمِ O فَأَرَادُوا بِهِ كَيْداً فَجَعَلْنَاهُمُ الْأَسْفَلِينَ O وَقَالَ إِنِّي ذَاهِبٌ إِلَى رَبِّي سَيَهْدِينِ O (۹۹۔۹۷/۳۷)۔

بولے بناؤ اس کے واسطے ایک عمارت پھر ڈالو اس کو آگ کے ڈھیر میں۔ پھر چاہنے لگے اس پر برا داؤ کرنا پھر ہم نے ڈالا انہی کو نیچے اور (حضرت ابراہیمؑ) بولا میں جاتا (ہجرت کرتا) ہوں اپنے رب کی طرف وہ مجھ کو راہ دے گا۔

ان آیات سے واضح ہوتا ہے کہ لوگوں نے ابراہیمؑ کے خلاف اس منصوبے کا ارادہ کیا تھا' انہیں آگ کی بھٹی میں نہیں ڈالدیا تھا۔ وہ ابھی اپنی تدبیروں میں لگے ہوئے تھے کہ حضرت ابراہیمؑ اس مقام سے ہجرت فرما کر دوسری جگہ تشریف لے گئے۔ اس ضمن میں تفسیر عثمانی میں بھی وضاحت کی گئی ہے کہ جب قوم کی طرف سے مایوسی ہوئی تو حضرت ابراہیمؑ نے ہجرت کا ارادہ

کیا اللہ تعالیٰ نے آپ کو ''شام'' کا راستہ دکھلایا۔

(۱۶) انہی صفحات میں درج ہے کہ:

حضرت ہاجرہ اور شیر خوار بچے کو بیت اللہ (خانہ کعبہ) کے قریب چھوڑ آئے جہاں کوئی آبادی تھی اور نہ پانی۔

حضرت ابراہیمؑ کا اپنی بہو اور شیر خوار بچے کو ایسی جگہ چھوڑ دینا' جہاں پانی تک دستیاب نہ ہو' زیبِ داستاں کے لئے موزوں ہوسکتا ہے لیکن رسول کی شان اور مقام سے مطابقت نہیں رکھتا۔ یہاں وادی' غیر ذی روح' (بے برگ و گیاہ) تھی لیکن جس مقام پر حضرت اسماعیلؑ کو آباد کیا تھا وہ ﴿بَــلَــدٌ﴾ شہر تھا۔ اس کی وضاحت میں راغب اصفہانی نے مفردات القرآن میں وضاحت کی ہے کہ:

اَلْبَــلَــدُ (شہر) وہ مقام ہے جس کی حد بندی کی گئی ہو اور وہاں لوگ آباد ہوں۔ اس آیت میں جہاں حضرت اسماعیلؑ کے بسانے کے شہر کو امن کا گہوارہ بنانے کی استدعا ہے:

رَبِّ اجْعَلْ هَـٰذَا الْبَلَدَ آمِناً...... (۱۴/۳۵)۔

میرے پروردگار۔ اس شہر کو (لوگوں کے لئے) امن کی جگہ بنادے۔

اس سے ظاہر ہے کہ آپ حضرت اسماعیلؑ اور ان کی والدہ کو کسی ویرانے میں نہیں چھوڑ آئے تھے بلکہ سرزمینِ حجاز میں بلد (مکہ کی بستی) میں آباد کیا تھا۔

(۱۷) انہی صفحات میں درج ہے کہ:

اللہ تعالیٰ نے ابراہیمؑ کو انہیں (اپنے بیٹے حضرت اسماعیلؑ کو) ذبح کرنے کا حکم دیا اور (حکم کی تعمیل میں) حضرت ابراہیمؑ نے اپنے بیٹے کے گلے پر چھری رکھ دی۔ اس وقت اللہ تعالیٰ نے اسماعیل علیہ السلام کی جگہ دنبہ بھیج دیا۔

اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کی یہ (دنبہ کی) قربانی قبول فرمائی۔ قربانی کی یہ سنت آج تک جاری ہے اور قیامت تک صاحب استطاعت مسلمانوں کے لئے ضروری قرار دی گئی۔

جہاں تک بیٹے حضرت اسماعیلؑ کی قربانی کا ذکر ہے' ہمیں شروع ہی میں واضح کرنا ہوگا کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکم نہیں تھا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام خواب کے ایک اشارے سے سمجھے کہ حکم ملا ہے کہ بیٹے کو اللہ کی راہ میں قربان کردیا جائے۔ ہر چند یہ حکم نہیں تھا' محض خواب میں ایسا دیکھا تھا لیکن انہوں نے اسے کچھ ''اُدھر کا اشارہ'' سمجھ لیا۔ اس واقعہ کے متعلق قرآن سے یوں تفصیل حاصل ہوتی ہے۔

يَا بُنَيَّ إِنِّيْ أَرَى فِيْ الْمَنَامِ أَنِّيْ أَذْبَحُكَ فَانظُرْ مَاذَا تَرَى۔ (۱۰۲/ ۳۷)۔

اے فرزند! میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ تجھے ذبح کر رہا ہوں۔ کہو تمہارا کیا خیال ہے؟ جب فرزند نے بخوشی ذبح ہونے کی حامی بھری اور حضرت ابراہیمؑ نے بھی اپنے آپ کو تیار پایا' تو

فَلَمَّا بَلَغَ مَعَهُ السَّعْيَ قَالَ يَا بُنَيَّ إِنِّيْ أَرَى فِيْ الْمَنَامِ أَنِّيْ أَذْبَحُكَ فَانظُرْ مَاذَا تَرَى قَالَ يَا أَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ سَتَجِدُنِيْ إِن شَاء اللَّهُ مِنَ الصَّابِرِيْنَ O فَلَمَّا أَسْلَمَا وَتَلَّهُ لِلْجَبِيْنِ O وَنَادَيْنَاهُ أَنْ يَا إِبْرَاهِيْمُ O قَدْ صَدَّقْتَ الرُّؤْيَا إِنَّا كَذَلِكَ نَجْزِيْ الْمُحْسِنِيْنَ O (۱۰۵۔۱۰۲/ ۳۷)۔

جب وہ دونوں جھک گئے اور اسے (بیٹے کو) ماتھے کے بل لٹایا۔ اور ہم نے اسے پکارا کہ اے ابراہیمؑ تو نے خواب سچ کر دکھایا۔

حضرت ابراہیمؑ نے جو رویا دیکھا اس کا منشا یہی سمجھا کہ حضرت اسماعیلؑ کی قربانی دی جائے' لہٰذا انہوں نے تیاری کر لی' لیکن اللہ تعالیٰ نے انہیں اس سے بڑے مقصد کے لئے اپنا لیا تھا اور وہ مقصد ذبح عظیم تھا۔

وَتَرَكْنَا عَلَيْهِ فِيْ الْآخِرِيْنَ (۱۰۸/ ۳۷)۔

اور ہم نے ایک عظیم قربانی اس کا فدیہ دیا۔ اور ہم نے آنے والی نسلوں کے لئے اس کا (ذکر خیر) باقی رکھا۔

تورات میں اس ذبح عظیم کا نعم البدل بطور فدیہ مینڈھا کی قربانی کو پیش کیا گیا ہے۔ قرآن سے البتہ مینڈھا کا ذکر نہیں ملتا' بلکہ بیت اللہ کی تولیت 'خانہ خدا کی پاسبانی' کا فریضہ سونپنے کا ذکر آتا ہے' جس کے لئے دنیا کی ہر آسائش کو قربان کر دینا تھا۔

آخر میں یہ تاثر دینا قرآنی عظمتوں کو پستیوں کی طرف لے جانے کے مترادف ہے کہ حضرت اسماعیلؑ کی قربانی کے مقابلے میں بھیڑوں' بکریوں کی قربانی ''ذبح عظیم'' ہے۔ اللہ نے انہیں چھری سے بچا کر حکم دیا کہ مکہ کی بے برگ و گیاہ وادی میں ''ہمارا گھر'' بناؤ اور حضرت اسماعیلؑ کو اس کی پاسبانی کے لئے وقف کر دو۔ سرزمین شام کی شادابیوں اور شگفتگیوں کی جگہ صحرائے عرب کا مسکن اور منصبِ سرداری اور حکمرانی کے بجائے عبادت گاہ کی تولیت۔ یہ تھی وہ بڑی قربانی بلکہ یوں کہئے پشتوں تک کی قربانی جس کے لئے حضرت اسماعیلؑ کو چھڑا لیا گیا تھا نہ کہ چند لمحوں کے لئے جانور کی قربانی۔

باقی رہا حج کے موقع پر حاجیوں کے' مکہ معظّمہ میں جانور ذبح کرنے کے عمل کو قربانی کا نام دینا' تو یہ علیحدہ مسئلہ ہے۔ قرآن نے ان جانوروں کے ذبح کرنے کے لئے ''قربانی'' کا لفظ استعمال نہیں کیا۔ لہٰذا اسے ''ذبح عظیم'' کے ضمن میں سنت ابراہیمی سے منسوب کرنا قرآن کی تعلیم سے مطابقت نہیں رکھتا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

(آٹھواں باب)

سورۃ الفاتحۃ

(آیت 6)

عزیزانِ من! سابقہ درس میں ہم نے دیکھا یہ تھا کہ خدا پر ایمان رکھنے والوں اور اس کے مقرر کردہ نصب العین تک پہنچنے والوں کی یہ شدتِ آرزو ''دعا'' بن کر ان کر لبوں پر آئی تھی کہ اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ (1:5) ہماری راہنمائی سیدھی، توازن بدوش راہ کی طرف کی جائے۔ اب یہ ایک ایسا اصول یا کلیہ یا نظریہ یا آئیڈیا پیش کیا گیا جو Abstract (بسیط) تھا، محسوس (Concrete) نہیں تھا۔ قرآنِ کریم کا انداز یہ ہے کہ وہ جہاں ایک کلیہ یا نظریہ پیش کرتا ہے، تو اسے وہ تصوراتی یا صرف آئیڈیل نہیں رہنے دیتا بلکہ محسوس انداز سے اس کی خود وضاحت کرتا ہے تاکہ کوئی شخص خود فریبی میں مبتلا نہ ہو جائے کہ اپنے طور پہ سمجھ لے کہ میں اس کلیہ یا اصول کا اتباع کر رہا ہوں، یا کوئی دوسرا اسے دھوکا نہ دے کہ وہ غلط طریق پر چلا جا رہا ہو اور کہہ یہ رہا ہو کہ یہ وہی چیز ہے کہ جو خدا نے اپنے ہاں کہی ہے۔ دونوں قسم کی گمراہیاں دنیا میں موجود ہیں: خود فریبی کی بھی، اور فریب کاروں کی پھیلائی ہوئی بھی۔ قرآنِ کریم نے ان دونوں سے بچانے کے لیے کیا یہ ہے کہ جہاں وہ کوئی Truth (صداقت) بیان کرتا ہے، کوئی حقیقت بیان کرتا ہے، تو اسے Abstract (غیر محسوس) نہیں رہنے دیتا، Concrete (محسوس) شکل میں اس کی مثالیں پیش کر دیتا ہے تاکہ یہ پرکھنے میں کسی قسم کا شک وشبہ نہ رہے کہ جس چیز کی ہم آرزو رکھتے ہیں، یہ وہی ہے، کہیں التباس تو نہیں، ابہام تو نہیں، دھوکا تو نہیں، فریب تو نہیں۔

تقابلی انداز کے ساتھ ''انعمت علیہم'' کے مفہوم کی وسعت

یہ جو صراطِ مستقیم تھی، اس کے متعلق اگلے ہی لفظ میں یہ کہہ دیا کہ صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ (1:6) یہ اُن لوگوں کا راستہ ہے جنہیں تو نے اپنے انعامات، اپنی نعمتوں، سے نوازا۔ اب آپ یہ چیز دیکھتے ہیں کہ وہ صداقت Abstract (غیر محسوس) سے محسوس شکل میں آ گئی اور پھر اس میں اَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ (1:6) آیا ہے۔ یہ ماضی کا صیغہ ہے اور اس میں بھی قرآن کی بڑی حقیقت پوشیدہ ہوتی ہے۔ قرآن کا انداز یہ ہے کہ جہاں وہ اپنا کوئی کلیہ یا صداقت یا نظریہ یا اصول پیش کرتا ہے، تو اس کی صداقت کے ثبوت میں

تاریخی شواہد پیش کرتا ہے۔ اقوامِ سابقہ کی داستانیں لاتا ہے اور ان سے یہ کہتا ہے کہ تم دیکھ لو' تاریخ کے اوراق سے پوچھ لو کہ جس قوم نے اس اصول پر عمل کیا' اس قوم کو کیا کچھ نصیب ہوا' اور جس قوم نے اس کی' خلاف ورزی کی وہ کس طرح تباہیوں اور بربادیوں کے عذاب میں مبتلا ہوئی۔ گویا وہ اپنے پیش کردہ صداقت کے ثبوت میں تاریخی شواہد پیش کرتا ہے اور تاریخ تو Past (ماضی) سے متعلق ہوتی ہے۔ اسی لیے قرآنِ کریم' اپنے اس قسم کے کلیہ کو' جب آگے محسوس شکل میں پیش کرتا ہے تو ہمیشہ Past Tense (زمانہ ماضی) میں یہ کہہ کے کہتا ہے کہ یہ چیزیں ہو چکی ہیں' وہ لوگ گزر چکے ہیں' تاریخ اس قسم کی شہادت دے گی کہ وہ کون لوگ تھے۔ جس طرح اس نے استخلاف فی الارض کے متعلق کہا۔ نظامِ اسلامی یا حکومتِ خداوندی کے متعلق یہ آیت درس میں ایک دفعہ نہیں' میرا خیال ہے کئی دفعہ آ چکی۔

استخلاف فی الارض کے سلسلہ میں تاریخی شواہد کا ذکر

اس وقت استخلاف فی الارض کے متعلق میں عرض کرنا چاہتا ہوں' کہ وہ کس طرح تاریخی شواہد کو پیش کرتا ہے۔ خدا تعالیٰ نے قرآن کریم میں کہا تھا کہ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ (24:55) خدا کا یہ وعدہ ہے' یہ قانون ہے کہ تم میں سے جو بھی ایمان کے ساتھ اعمالِ صالحہ کے پروگرام پر عمل پیرا ہوتا ہے وہ اُسے اس زمین پر' اس دنیا میں' استخلاف عطا کرتا ہے حکومت عطا کرتا ہے۔ اس کا یہ وعدہ' یہ قانون اٹل ہے۔ اب ہمارے ہاں مذہب اور طریقت میں آ کر استخلاف فی الارض کے بارے انہوں نے کہا کہ یہ روحانیت کے مدارج ہیں جبکہ اہلِ شریعت نے کہا کہ نہیں صاحب! یہ جنت کی ارض ہے وہاں جا کر یہ خلافت ملے گی۔ چنانچہ قرآن نے ان تمام تصورات کی تردید کر دی۔ قرآنِ حکیم میں اس کے فوراً بعد جو اگلا لفظ ہے' وہ ماضی کا صیغہ ہے' اس میں استخلاف فی الارض کے بارے میں کہا کہ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ (24:55) جس طرح کی خلافت ارضی اس نے پہلی اقوام کو عطا کی۔ تو اب اسے ہم تاریخ میں دیکھ لیں گے اور قرآنِ کریم پھر ان اقوامِ عالم کی شہادات پیش کر کے کہتا ہے کہ یہ تھی وہ قوم جسے ہم نے استخلاف فی الارض سے نوازا تھا۔ اس کی حکومت کو دیکھو' ان کی مملکت کو دیکھو' ان کی قوتوں کو دیکھو' ان کے اقتدار کو دیکھو۔ تاریخ نے بتا دیا کہ استخلاف فی الارض سے مفہوم کیا ہے۔ اب اس مرئی (Visible) اور محسوس شہادت (Concrete Evidence) کے بعد' نہ کوئی اپنے آپ کو دھوکے میں رکھ سکتا ہے' نہ کسی کے دھوکے میں آ سکتا ہے۔ قرآنِ کریم نے اپنے اسی اصول کے ماتحت یہ کہا کہ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ (1:6) سابقہ زمانوں میں جن پر تو نے اپنا انعام کیا' جنہیں اپنی نعمتوں سے نوازا۔

قرآنِ حکیم اور تاریخی شواہد کی روشنی میں نعمتوں اور ''منعم علیہ'' کی وضاحت

اب دو چیزیں ہیں جو ہمارے لیے سمجھنے کی ہوگئی ہیں۔ایک تو یہ کہ اس کے نزدیک نعمت سے مراد کیا ہے اور دوسری چیز یہ کہ جن اقوام کو ان انعامات یا ان نعمتوں سے نوازا تھا' تاریخ ان کے متعلق کیا بتاتی ہے کہ ان کی کیفیت کیا ہوگئی تھی۔اب نعمت کا مفہوم بھی قرآن سے متعین ہو جائے گا اور اس کے بعد جن کو ان نعمتوں سے نوازا گیا' جنہیں منعم علیہ کہتے ہیں' ان اقوام کی داستانوں سے ہی معلوم ہو جائے گا کہ جن قوموں کو خدا کی نعمت' خدا کے انعامات میسر ہوتے ہیں یا میسر ہوتے تھے' ان کی کیفیت کیا تھی۔اگر ہماری وہ کیفیت ہو جاتی ہے تو ہم سمجھتے ہیں کہ ہمارا شمار ان میں ہو گیا' ہم وہ قوم بن گئے کہ جن کے متعلق کہا تھا' کہ وہ لوگ جن پر تیرے انعامات ہوئے۔اور اگر وہ کیفیت ہماری پیدا نہیں ہوئی تو اس کے بعد یا ہم خود فریبی میں مبتلا ہیں یا ہمیں فریب دیا جا رہا ہے۔آپ نے غور فرمایا کہ صرف اتنی سی چیز سے' کہ اس نے یہاں ماضی کا صیغہ کیوں استعمال کیا ہے' کیوں وہ Past (زمانہ ماضی) کی طرف لے گیا' کے اندر کتنی بڑی اہمیت ہے! عزیزانِ من! قرآن کے دعاوی کے پرکھنے کا معیار' تاریخ کی شہادات ہیں' تو یہاں کہا کہ صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ (1:6) یہ وہ راستہ ہے' وہ صراطِ مستقیم ہے جس پر چلنے سے انعاماتِ خداوندی کی بارش ہوتی ہے۔انعاماتِ خداوندی کیا ہیں جنہیں ان سے نوازا گیا؟ اُن کی کیفیت تاریخ کے اندر کیسی ملتی ہے؟ یہ تمام چیزیں قرآنِ کریم کے اندر موجود ہیں اور یہی وہ چیزیں ہیں جن میں سے چند ایک وقت کی گنجائش کے اعتبار سے' میں آپ کے سامنے پیش کروں گا کہ انعام یافتہ قومیں' جن کو قرآن نے انعمت علیہم کہا ہے' کی پہچان کیا ہے' اور نعمت کسے کہتے ہیں؟

لفظ نعمت کا مفہوم

پہلے اس لفظ ''نعمت'' کا عربی زبان کے اعتبار سے مفہوم سمجھ لیجیے۔اس کا مادہ ''ن ع م'' ہے۔ عربوں کے ہاں ایک پودا ہوتا ہے۔معلوم نہیں آج کل بھی ہوتا ہے یا نہیں کیونکہ میں نے تو بہر حال لغت میں یہ چیز دیکھی ہے' وہ اسے **نعیمۃ** کہتے ہیں۔اس کی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ اس کے پتے نرم و نازک اور سرسبز و شاداب ہوتے ہیں اور وہ پانی پر اُگتا ہے۔اس لیے اس کی تروتازگی میں کبھی فرق نہیں آتا۔نرم و نازک' سرسبز و شاداب' جس کی تروتازگی میں کبھی فرق نہ آئے اور اس کے ساتھ ہی غالباً وہ پودا اوپر کی طرف جاتا ہوگا' بلند بھی ہوتا ہوگا۔اس لیے کہ اُن کے ہاں اسی مادہ ''ن ع م'' میں بلندی اور سرفرازی کا مفہوم بھی ہوتا ہے۔چنانچہ **النعامۃ** اس عمارت کو کہتے ہیں جو پہاڑ پر تعمیر کی گئی ہو' نیز کسی اونچے نشان یا جھنڈے کو بھی' جس سے راستے کا پتہ چلایا جائے۔ان معانی سے واضح ہے کہ انسانی زندگی کے ہر پہلو کا خوش گوار' کشادہ' ملائم' آسودہ' بلند اور سرفراز ہونا نعمت کا مظہر ہے۔جن لوگوں کی زندگی اس قسم کی

ہوگی انہیں ''منعم علیہ'' کہا جائے گا۔یعنی وہ جنہیں خدا کی نعمتیں حاصل ہیں۔اب یہ ہے وہ اجمال جس کی تفصیل قرآنِ کریم کے مختلف مقامات میں ملے گی اور انہی میں سے چند ایک میں آپ کی خدمت میں اس وقت پیش کروں گا۔

قرآنِ حکیم کے اندر قوم بنی اسرائیل کا تذکرہ قوموں کی موت وحیات کے لیے ایک آئینہ ہے

سورۂ البقرۃ میں بنی اسرائیل کی داستان کو بڑی ہی تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔اس کے علاوہ قرآنِ کریم کے متعدد مقامات پر اس داستان کو دہرایا گیا ہے کہ اس کے اندر قوموں کے عروج وزوال کے ابدی اصول مضمر ہیں' ان ابدی اصولوں کی تاریخی شہادات اس قوم کی داستان سے ملتی ہیں۔اس لیے اس قوم کی داستان کو خاص طور پہ بڑی ہی شرح وبسط سے دہرایا ہے اور دوسرے اس لیے بھی کہ زمانہ نزولِ قرآن کے وقت یہ قوم عربوں کے خود سامنے تھی۔وہاں عربوں کے ہاں یہ قوم بستی تھی۔ساری دنیا میں ان کی ذلت ورسوائیاں' ہر قوم کے سامنے تھیں اور آج تک اس قوم کی یہ کیفیت رہی۔یہ دوسری بات اور آگے چل کے میں یہ بیان کروں گا کہ یہ دوسروں کے سہارے سے انہوں نے ایک چھوٹی سی مملکت قائم ضرور کر لی ہے لیکن پوری تاریخ آپ کو بتائے گی کہ ان کی اصلیت کیا ہے۔تاریخ کے اندر ان کا نام صحرانورد خانہ بدوش تھا' جن کا نہ کوئی گھر' نہ گھاٹ تھا لیکن اس سے پہلے ان کے اوپر ایک ایسا دور آیا کہ جس میں یہ سطوتِ داؤدی اور شوکتِ سلیمانی کی حامل بھی تھی۔تو وہ یہی قوم تھی' وہ عروج بھی انہی کا تھا' یہ زوال بھی انہی کا ہے۔یہ ہنگامی اور اتفاقی طور سے نہیں ہو گیا' خدا کے اٹل قوانین کی رو سے ہوا ہے اور اسی لیے میں نے یہ کہا ہے کہ جو قوموں کے عروج اور زوال کے اصول ہیں' وہ اس قوم کی تاریخ کے اندر' شہادتوں کے طور پر' ہمارے سامنے آتے ہیں۔آیئے! دیکھیں' کہ سب سے پہلے قرآنِ کریم نے یہ منعم علیہ کی حیثیت سے' جنہیں نعمتوں سے نوازا گیا' اس قوم کی داستان کا آغاز سورۂ البقرہ سے یہ کہہ کر کیا ہے کہ یٰبَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ اذۡکُرُوۡا نِعۡمَتِیَ الَّتِیۡۤ اَنۡعَمۡتُ عَلَیۡکُمۡ (2:40) اے قوم بنی اسرائیل! تم خدا کی اس نعمت کو یاد کرو' جس سے اس نے تمہیں نوازا تھا۔بنی اسرائیل فرعون [1] جیسے مستبد بادشاہ کی غلامی اور محکومیت کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی تھی۔گویا یہ ایک محکوم قوم تھی۔وہ کون سی چیز ہے' وہ کون سی نعمت ہے' جس کی انہیں یاددہانی کرائی گئی؟

قومِ بنی اسرائیل کو نعمتوں سے سرفراز کرنے کی یاددہانی

عزیزانِ من! وہ نعمت یہ ہے کہ وَ اِذۡ نَجَّیۡنٰکُمۡ مِّنۡ اٰلِ فِرۡعَوۡنَ یَسُوۡمُوۡنَکُمۡ سُوۡٓءَ الۡعَذَابِ یُذَبِّحُوۡنَ اَبۡنَآءَکُمۡ وَ یَسۡتَحۡیُوۡنَ

---

[1] اس کی تفصیل کے لیے یہ دو کتب دیکھیے: (ا) مطالب الفرقان فی دروس القرآن سورۃ بنی اسرائیل' ادارہ طلوعِ اسلام رجسٹرڈ' لاہور' 2004ء' ص 109۔
(ب) مطالب القرآن فی دروس الفرقان سورۃ طٰہٰ' ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ' لاہور' 2005' ص 119۔

نِسَآءَكُمْ ط وَ فِیْ ذٰلِكُمْ بَلَآءٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَظِیْمٌ (2:49) تم اس نعمت کو یاد کرو کہ خدا نے کس طرح تمہیں فرعون جیسے مستبد' ظالم بادشاہ کی غلامی اور محکومی سے نجات دلائی' وہ ڈھونڈ ڈھونڈ کر تمہیں عذاب دیا کرتا تھا اور سب سے بڑا عذاب یہ تھا کہ تمہاری قوم میں جہاں اس نے دیکھا کہ کوئی شخص ایسا پیدا ہو رہا ہے جس میں ابھرنے کی صلاحیتیں ہیں' وہ انہیں ہمیشہ کچل دیا کرتا تھا اور اپنے مقرب اُن لوگوں کو بنایا کرتا تھا جن میں جوہرِ مردانگی مفقود ہوں۔ میں ذبح ابناء استحیاء نساء (2:49) کی تفصیل آگے چل کر سورۃ البقرۃ میں بیان کروں گا۔ اس کے عام معنی تو یہ لیے جاتے ہیں کہ فرعون بنی اسرائیل کے بچوں (لڑکوں) کو پیدا ہوتے ہی ذبح کر کے مار دیا کرتا تھا اور ان کی لڑکیوں کو زندہ رکھا کرتا تھا۔ اس کا مفہوم یہ نہیں ہے۔ میں وہاں' آگے چل کر' تفصیل سے بیان کروں گا' یہاں میں نے ویسے ہی مفہوم ادا کر دیا ہے۔ ابناء قوم کہتے ہی اُن کو ہیں جن میں جوہر مردانگی ہوں' جن میں ابھرنے کی' سرفرازیوں کی' مقابلہ کرنے کی' صلاحیت ہو اور ''یذبحون'' ذبح کے معنی قتل کر دینا یا ذبح کر دینا ہی نہیں ہیں' پست کر دینا' ذلیل کر دینا' بھی اس کے معنی ہوتے ہیں۔ قرآن یہ کہہ رہا ہے کہ یہ بہت بڑا عذاب تھا کہ اس نے تمہیں غلام بنا رکھا تھا اور پھر تم میں اگر کوئی ایسا شخص پیدا ہو جاتا تھا' جس کے متعلق اس کو شبہ گزرتا تھا کہ یہ ذرا سر ابھارے گا' اس کو وہیں کچل دیتا تھا اور ان لوگوں کو اپنے قریب کرتا تھا' جن میں جوہرِ مردانگی نہیں ہوئے تھے۔ دوسری جگہ یہ ہے کہ وہ اُن لوگوں کو اوپر چڑھاتا تھا جو جوہر مردانگی سے عاری ہوتے تھے۔ یہ بڑا ہی سخت عذاب تھا' بہت بڑی ذلت آمیز سزا تھی' یہ وہ عذاب تھا جس میں تم مبتلا تھے۔

اب سوال یہ ہے کہ یہ نعمت کیا تھی؟ اس کا جواب یہ دیا کہ اِذْ نَجَّیْنٰكُمْ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ [1] (2:49) اس سے' سب سے پہلے تاریخ میں ہمارے سامنے یہ چیز آئی یا قرآنِ کریم میں ہمارے ہاں یہ آئی کہ کسی قوم کا مستبد حاکم' فرماں روا کے پنجہ استبداد سے نجات حاصل کر لینا' خدا کی نعمت ہے لیکن یہ کسی کی غلامی سے آزادی حاصل کر لینا تو منفی پہلو (Negative Aspect) ہے' تو یہ ایسی قوموں کے اندر اس کا شمار ہو گیا جو کسی کی محکوم نہیں' بلکہ ان کو آزادی ملی ہے۔ تو محکومی سے آزادی ملنا ایک نعمت ہوا لیکن جیسا کہ میں نے نجات (Salvation) کے سلسلے میں پہلے بھی کہا تھا' کہ اس سے کوئی Achievement (فوز و فلاح) نہیں ملی' ایک عذاب سے چھٹکارا ہے' گلوخلاصی ہے' نجات پانا ہے۔ اس کے بعد قرآنِ کریم اس کا Positive Aspect (مثبت پہلو) بھی سامنے لایا۔ وہ Positive Aspect (مثبت پہلو) جو اس نے کہا یہ تھا کہ یٰبَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِیَ الَّتِیْٓ اَنْعَمْتُ عَلَیْكُمْ وَ اَنِّیْ فَضَّلْتُكُمْ عَلَی الْعٰلَمِیْنَ (2:47) اے قومِ بنی اسرائیل! تم خدا کی اِس نعمت کو یاد کرو کہ اس نے تمہیں تمہاری ہم عصر اقوام پر افضلیت

---

[1] تم نے قوانینِ خداوندی کا اتباع کیا تو اس نے تمہیں سب سے پہلے فرعون کے اس عذاب سے نجات دلائی (مفہوم القرآن از پرویزؒ۔ ص 18)

عطا فرمائی ہے۔ باالفاظ دیگر ''منعم علیہ'' وہ قوم ہے جو اپنی ہم عصر اقوام میں نہایت ممتاز اور بلند و بالا مقام رکھتی ہو۔ یعنی دیگر اقوام کی ہم دوش ہی نہیں، ان کے برابر چلنے والی نہیں، بلکہ ان سے بہت آگے اور سربلند۔ یہی ہے جسے قرآن فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ (2:47) کہتا ہے یعنی اپنی ہم عصر اقوام میں ممتاز حیثیت کے مالک۔ قرآن کریم نے جب امت مسلمہ، جماعت مومنین، کے متعلق کہا تھا کہ اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ (3:138)۔ تو اس میں اعلون کے معنی ہیں: سب پر غالب، سب سے اونچے۔ اس سے یہی بات ہوئی کہ یہی نہیں کہ تم باقی قوموں کے ہم دوش چلو بلکہ تمام اقوامِ عالم سے بلند و بالا ہو جاؤ۔ علامہ اقبالؒ (1877-1938ء) کے الفاظ میں:

مومن بالائے ہر بالا ترے

مومن کی غیرت تو یہ بھی گوارا نہیں کرتی کہ کوئی دوسرا اس کی سرفرازی کے ہم پلہ ہو

مومن کی پہچان یہ ہے کہ کوئی کتنا ہی اونچا ہو، وہ اس سے بھی اونچا ہوتا ہے، کوئی قوم کتنی ہی سربلند ہو، وہ اس سے بھی اوپر ہوتی ہے۔ اس پہ غالب ہوتی ہے۔ یہ ہے بالائے ہر بالا ترے اور آگے کہتا ہے کہ

غیرت او بر نتابد ہمسرے

کسی کا اس سے آگے بڑھ جانا تو کجا، مومن کی غیرت تو اس کو بھی گوارا نہیں کرتی کہ کوئی دوسری قوم اس کے ہم دوش اور ہم سر ہو جائے۔ وہ قوم جو انعاماتِ خداوندی سے، نوازی جاتی ہے، اس کا Negative Aspect (منفی پہلو) تو یہ ہے کہ وہ کسی کی غلامی میں نہیں ہوتی، اسے ہر قسم کی غلامی سے چھٹکارا ملتا ہے اور اس کا Positive Aspect (مثبت پہلو) یہ ہے کہ وہ اپنی ہم عصر اقوام میں سربلند اور بالاتر ہوتی ہے۔ پہلی چیز تو نعمت کے اندر یہ ہے۔ اسی نعمت کا ذکر لبوں پہ یوں آیا کہ بارالٰہا! ابھر اور نکھر کر صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ (1:6) ان لوگوں کا راستہ سامنے آ جائے جو تیرے انعامات سے سرفراز ہوئے۔ اگر یہ قوم، جو یہ تمنا لے کر ابھری ہے، کسی مستبد حاکم کی محکومی میں ہے تو اسے غیر خداوندی احکام اور حاکمیت سے نجات مل جائے۔ انسانی غلامی کے اندر ہونا ہی غلامی ہے، خواہ اس قوم میں خوشحالی ہی کیوں نہ ہو بلکہ یہ کہ اپنی حکومت بھی کیوں نہ ہو اور وہ احکامِ خداوندی وہاں نافذ نہ ہو رہے ہوں، تب بھی یہ قوم غلام کی غلام ہی ہوتی ہے۔ اس طرح پہلی چیز تو یہ ہے کہ غیر خداوندی احکام اور حاکمیت سے نجات مل جائے۔ انعام یافتہ قوم کی پہلی شرط یہ چیز ہوگئی اور دوسری شرط یہ ہوئی کہ وہ اپنی ہم عصر اقوام میں سب سے بلند و بالا اور ممتاز ہو۔ یہ اس قوم کی دوسری نشانی ہوگئی، جس پر خدا کی نعمتیں نچھاور ہوتی ہیں۔

''صراطِ مستقیم'' کی سب سے بڑی نشانی احکام اللہ کے تابع زندگی بسر کرنے کے لیے آزاد ہونا ہے

اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ ❶ (1:5) میں صراطِ مستقیم کا پہلا نشان' پہلا نصب العین یا پہلی منزل یہ ہے کہ وہ قوم آزاد ہوتی ہے' خدا کے احکام کے تابع زندگی بسر کرنے کے لیے وہ اقتدار رکھتی ہے اور اپنی ہم عصر اقوام میں سب سے بلند و بالا ہوتی ہے۔ عزیزانِ من! قومِ بنی اسرائیل کی داستان میں اس قسم کی افضلیت حضرتِ سلیمانؑ اور حضرتِ داؤدؑ کے زمانے میں اپنے نکتہ کمال پر پہنچی۔ چنانچہ حضرتِ سلیمانؑ کا یہ اعتراف بلکہ یہ دعا قرآنِ کریم میں مذکور ہے کہ رَبِّ اَوْزِعْنِیْٓ اَنْ اَشْکُرَ نِعْمَتَکَ الَّتِیْٓ اَنْعَمْتَ عَلَیَّ وَ عَلٰی وَ الِدَیَّ (27:19) اے میرے رب! مجھے اس کی توفیق عطا فرما کہ میں تیری اُس نعمت کا شکریہ ادا کروں' جس سے تو نے مجھے اور میرے والدین کو نوازا ہے۔ اس سے آپ دیکھ لیجیے کہ وہ جو فَضَّلْتُکُمْ عَلَی الْعٰلَمِیْنَ (2:47) کہا تھا یعنی ہم عصر اقوام پر افضلیت حاصل کرنا' تو وہ کس طرح حضرتِ داؤد اور حضرت سلیمانؑ کے زمانے میں ہوئی اور انہوں نے کس طرح اس کا اعتراف کیا کہ اَنْ اَشْکُرَ نِعْمَتَکَ الَّتِیْٓ اَنْعَمْتَ عَلَیَّ وَ عَلٰی وَ الِدَیَّ (27:19). حضرتِ سلیمانؑ اور ان کے والد حضرت داؤدؑ کو جس انداز کی سطوت و شوکت' طاقت و قوت اور عفت عطا ہوئی تھی' اسے ''خدا کی نعمت'' کہا گیا۔

انسان کا یہ پیکر آب و گل ذات انسانی کی نشو و نما کا ایک ذریعہ ہے مقصود بالذات نہیں

میں پہلے تفصیل سے بتا چکا ہوں کہ انسانی زندگی کا مقصود بالذات تو یہ چیز ہے کہ اس کے نفس' اس کی ذات' اس کی خودی کی ایسی نشو و نما اور تربیت ہو جائے' اُس میں ایسی پختگی اور نمود پیدا ہو جائے کہ وہ اس زندگی کے بعد کی زندگی کے اگلے مراحل طے کرنے کے بھی قابل ہو جائے لیکن اس کرۂ ارض پر جو خدا کا نظام ہے' اس میں انسانی خودی کی یہ تربیت' یہ نشو و نما' یہ نمود' یہ استحکام' مادی سطح پر ہوتا ہے اور مادی ذرائع سے ہوتا ہے' خود اس کا جسم بھی تو ایک Physical Body (مادی جسم) ہے' اس کے اندر رہتے ہوئے یہ سارا کچھ کر سکتے ہیں' تو گویا یہ مقصود بالذات نہیں۔ جیسا کہ میں نے غالباً مثال میں بتایا تھا کہ گھوڑا ہمیں کسی مقام تک پہنچانے کے لیے ایک ذریعہ ہوتا ہے' مقصود بالذات نہیں ہوتا لیکن سفر کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ گھوڑا تندرست ہو' توانا ہو' تربیت یافتہ ہو۔ اس کا کمزور ہونا یا سرکش ہونا ہمیں سفر کے قابل نہیں رکھتا۔ گھوڑا مقصود بالذات نہیں لیکن ہمارے مقصد کے حصول کا ذریعہ ضروری ہے اور اس ذریعے کا

---

❶ یہ افراد (جماعتِ مومنین) جب سفرِ حیات کے لیے قدم اٹھاتے ہیں' تو یہ حسین تمنائیں اور مقدس آرزوئیں' دعا بن کر ان کے لبوں تک آ جاتی ہیں کہ: بارِالٰہا! زندگی کا وہ سیدھا اور ہموار راستہ اُبھر اور نکھر کر سامنے آ جائے جو ہمیں' بلا خوف و خطر' ہماری منزلِ مقصود تک لے جائے (مفہوم القرآن از پرویزؒ، ص۔ا۔ب۔

بھی تنومند اور توانا' صحت یافتہ' مناسب اور موزوں ہونا نہایت ضروری ہے۔ یہ وجہ ہے کہ قرآن نے رَبَّنَآ اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَۃً ❶ (2:201) پہلے کہا ہے وَّ فِی الْاٰخِرَۃِ حَسَنَۃً ❷ (2:201) اس کے بعد کہا ہے۔ اس دنیا کی حسنات' اس دنیا کی نعمتیں' اس دنیا کے اندر جتنے بھی سامان' ذرائع اور وسائل ہیں' ان کا نہایت فراخی نہایت کشادگی اور نہایت آسانی سے ملنا بھی خدا کی نعمتوں میں سے ہے۔

کائنات میں قدم قدم پر انگنت نعمتوں کا بکھیر دینا قدرت کا ایک احسان عظیم ہے

اس طرح سورۃ النحل کی ان آیات کو دیکھیے' جن میں کہا ہے کہ یہ پوری نوعِ انسانی کے لیے ہیں' کسی خاص قوم کے لیے نہیں ہیں۔ کہا کہ وَ اللّٰہُ جَعَلَ لَکُمْ مِّنْم بُیُوْتِکُمْ سَکَنًا ❸ (16:80) اللہ وہ ہے جس نے تمہیں ایسے مکانات دیئے جن میں تم امن اور اطمینان سے رہ سکتے ہو۔ وَّ جَعَلَ لَکُمْ مِّنْ جُلُوْدِ الْاَنْعَامِ بُیُوْتًا تَسْتَخِفُّوْنَھَا ❹ (16:80)۔ یہ تو مکان تھے' جو اینٹ اور پتھر کے بنے ہوئے تھے' جو ایک ہی مقام کے اوپر جامد و ساکن رہتے تھے اور یہ جو قومیں تھیں' صحرا نورد تھیں' خانہ بدوش تھیں آج یہاں' کل وہاں تو شہری یا تمدنی زندگی کے لیے تو وہ مکان بتائے جو ساکن و جامد ہیں۔ ان کے لیے کہا کہ یہ بھی خدا کی نعمت میں سے ہے کہ تمہیں اس قسم کے مویشیوں سے کھالیں دیں کہ جن سے تم ایسے خیمے بنا سکتے ہو یَوْمَ ظَعْنِکُمْ وَ یَوْمَ اِقَامَتِکُمْ ❺ (16:80) جنہیں نہایت آسانی سے' جہاں جی چاہے اپنے کندھے پر اٹھائے' لے جا سکتے ہو۔ یہ ہے مکان اور تمہارے ساتھ چلنے والا مقام۔ وَ مِنْ اَصْوَافِھَا وَ اَوْبَارِھَا وَ اَشْعَارِھَآ اَثَاثًا وَّ مَتَاعًا اِلٰی حِیْنٍ ❻ (16:80) اور یہ مویشی' یہ اونٹ' یہ بھیڑیں' اور بکریاں' ان کا دودھ تم پیتے ہو' ان کا گوشت تم کھاتے ہو' ان کی کھالوں سے یہ کچھ بناتے ہو' اور اس کے علاوہ ان کی اون سے تم مختلف قسم کی چیزیں بناتے ہو' کمبل بھی' خیمے بھی' لباس بھی۔ تو دیکھو تو سہی' یہ سارا کچھ خدا کا دیا ہوا ہے' یہ اس کی طرف سے انعامات ہیں' جو تمہاری اس طبعی زندگی کو اس قدر آرام دہ

---

❶ اے ہمارے نشوونما دینے والے! ہمیں دنیاوی زندگی کی خوشگواریاں حاصل ہوں۔

❷ اور اُخروی زندگی کی خوشگواریاں بھی میسر ہوں۔

❸ خدا نے تمہارے گھروں کو تمہارے لیے رہنے کی جگہ بنایا (جو ایک ہی جگہ قائم رہتے ہیں)۔ (مفہوم القرآن از پرویزؒ' ص 613)

❹ مویشیوں کی کھالوں سے تمہارے لیے خیمے بنا دیئے (جنہیں تم جہاں چاہو لیے لیے پھرتے ہو)۔ (مفہوم القرآن از پرویزؒ' ص 613)

❺ تم کہیں ڈیرا جماؤ یا وہاں سے کوچ کرو' دونوں حالتوں میں یہ خیمے بڑے ہلکے پھلکے رہتے ہیں۔ نہ لگانے میں دقت' نہ اٹھانے میں دشواری۔ (ایضاً)

❻ پھر بھیڑ اور دنبے کی اون' اونٹ کی پشم اور بکری کے بالوں سے' تمہارے لیے کتنے ہی سامان اور ضرورت کی چیزیں بنا دیں جو ایک وقت تک تمہارے کام آتی رہتی ہیں۔ (ایضاً)

ہی نہیں بناتے بلکہ مقصد کے حصول کے لیے یہ سامان اور ذرائع ایک وقت تک تمہارے کام آتے رہتے ہیں اور آگے بڑھیے۔ کہا کہ وَ اللّٰہُ جَعَلَ لَکُمْ مِّمَّا خَلَقَ ظِلٰلاً وَّ جَعَلَ لَکُمْ مِّنَ الْجِبَالِ اَکْنَانًا وَّ جَعَلَ لَکُمْ سَرَابِیْلَ تَقِیْکُمُ الْحَرَّ وَ سَرَابِیْلَ تَقِیْکُمْ بَاْسَکُمْ ❶ (16:81). خداوہ ہے جس نے تمہارے لیے پہاڑوں کے دامن میں' بلکہ ان کی غاروں کے اندر' سکون آفریں' آرام دہ' آسائش والی پناہ گاہیں اور حفاظت کے مقامات بنادیئے۔ اس نے تمہیں اس قسم کے لباس دیئے جو تمہیں گرمی سے بچاتے ہیں۔ اس نے تمہیں اس قسم کی زرہیں دیں جو جنگ میں تمہاری حفاظت کرتی ہیں۔ دیکھو تو سہی کہ اس نے تمہیں جو Physical (طبعی) زندگی عطا کی' اس زندگی کی حفاظت' پرورش' نشوونما کے لیے کیا کچھ نہیں دیا۔ اور اگلے الفاظ ہیں کہ کَذٰلِکَ یُتِمُّ نِعْمَتَہٗ عَلَیْکُمْ لَعَلَّکُمْ تُسْلِمُوْنَ (16:81) کس طرح خدا نے تمہارے لیے' اپنی نعمتوں کا اہتمام کیا ہے اور یہ سب کچھ ایک اور مقصد کے لیے ہے۔ وہ مقصد یہ ہے کہ تم قوانین خداوندی کے سامنے سرِتسلیم خم کرو۔ دنیاوی زندگی کی تمام پریشانیوں سے نجات پاؤ اور آرام واطمینان سے تمہیں ہر شے میسر ہو۔

اس کائنات کا وجود صرف اس چیز کا متقاضی ہے کہ انسان احکام خداوندی کے سامنے سرِتسلیم خم کردے

یہ چیزیں تو ایک کافر کو بھی میسر ہوسکتی ہے لیکن کافر اور مومن میں فرق یہ ہے: کہ کافر کو جو چیزیں میسر ہوتی ہیں تو وہ انہیں اپنی مرضی کے مطابق استعمال کرتا ہے اور یہاں یہ کہا گیا ہے کہ یہ سب کچھ تمہیں اس لیے دیا ہے کہ تم قوانین خداوندی کے سامنے سرِتسلیم خم کرو تاکہ تمہاری اپنی ذات کی بھی نشوونما ہوجائے اور ربوبیت عالمینی بھی ہوتی چلی جائے۔ ربوبیت عالمینی یہ ہے کہ ان چیزوں کو اپنی ذات تک ہی نہ رکھو بلکہ دوسروں کو بھی اس کے اندر شریک کرو۔ اس لیے کہ خدا کی حمد اس لیے تھی کہ وہ رب العالمین تھا۔ تمہیں بھی ربوبیت عالمینی کی روش اختیار کرنی چاہیے۔

ابن النعامۃ (یعنی نعمائے خداوندی کا بیٹا)

عزیزانِ من! اب ایک اور چیز سنیے اور جھوم جایئے۔ خود عربوں کے ہاں نعمت حاصل ہونے کے بعد وہ کون سا انداز تھا جسے وہ کہتے تھے کہ فی الواقع اس نے نعمت کی قدر کی ہے؟ ان کے ہاں ایک لفظ ابن النعامۃ تھا. یعنی نعمائے خداوندی کا بیٹا۔ یہ کون تھا؟ یہ عرب ابن النعامۃ اُس شخص کو کہتے تھے جو کنویں کی منڈیر کے اوپر کھڑا ہوا اور پیاسوں کو آواز دے دے کر بلا رہا ہو کہ آؤ' ٹھنڈا پانی

---

❶ اللہ نے تمہارے لیے اپنے پیدا کردہ درختوں کے سائے بنادیئے (کہ جہاں نہ مکان ہو' نہ خیمہ' تم ان کے نیچے دھوپ سے پناہ لے سکو)۔ نیز پہاڑوں میں تمہارے لیے چھپنے کی جگہیں بنادیں اور تمہارے لیے کپڑے بنادیئے جو تمہیں گرمی سے محفوظ رکھتے ہیں اور آہنی لباس (زرہ بکتر) جو تمہیں ہتھیاروں کی زد سے بچاتا ہے۔ (ایضاً)

پیتے چلے جاؤ: یہ پانی، یہ شیریں پانی! ❶ اور یہ تو آپ جانتے ہیں کہ پانی، کتنی بڑی نعمت تھی لیکن ان کے ہاں یہ پانی اس وقت نعمت بنتا تھا، جب منڈیر پر کھڑے ہو کر بلا بلا کر پیاسوں کو پلایا جائے۔ یہ فرق ہے کافر اور مومن میں، عزیزانِ من! ایک وہ ہیں جو اپنے جذبات اپنے ہی قوانین کے تابع رکھ کر زندگی بسر کرتے ہیں اور دوسرے وہ ہیں جو خدا کی نعمتوں کا استعمال خدا کے بتائے ہوئے اصول واقدار کے مطابق کرتے ہیں۔ ان کے ہاں جسے نعمت ملتی ہے، وہ اس کنویں سے خود ہی پانی نہیں پیتا، دوسروں کو بھی پلاتا ہے اور آوازیں دے دے کر پلاتا ہے۔ عجیب بات ہے ان عربوں کے ہاں! کس قدر کشادہ اور وسیع تصور تھا ان کا کہ کنویں کی منڈیر پہ کھڑا ہے اور راہ چلنے والوں کو آوازیں دے رہا ہے کہ آؤ، اس نعمت میں میرے ساتھ تم بھی شریک ہو جاؤ۔ اور یہ ہے لَعَلَّكُمْ تُسْلِمُوْنَ ❷ (16:81) جو قرآن نے کہا تھا تاکہ تم ہمارے اقدار اور اصول کے سامنے سرِ تسلیم خم کرو اس لیے تمہیں یہ نعمتیں دی جاتی ہیں۔

قرآن کا انداز یہ بھی ہے کہ وہ اپنا مفہوم اضداد کے ذریعے بھی واضح کرتا ہے۔ اگر اس نے بتانا ہوتا ہے کہ دیکھو روشنی میں کتنے فائدے ہیں، وہ کہتا یہ ہے کہ ذرا سوچو تو سہی کہ تاریکی میں کتنے نقصانات ہوتے ہیں۔ اسے کہتے ہیں اضداد کے ذریعے بات کو سمجھانا۔ یہاں جنہیں نعمتیں کہا ہے، وہ سارا کچھ زندگی کا ساز وسامان گنا دیا اور یہ کہا کہ ایک قوم وہ ہے کہ اس سارے ساز وسامان کو لے کر ہمارے قوانین کے تابع اسے صرف کرتی ہے، اس سے نعمتوں میں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے، افزائش ہوتی چلی جاتی ہے لیکن اگر ایسا نہ کیا جائے، کوئی ان کو دبا کر بیٹھ جائے، چھپا کر بیٹھ جائے، تو پھر کیا ہوتا ہے؟

ان خداداد نعمتوں کو چھپا کر رکھنے کا نتیجہ بالآخر خوف اور بھوک کی شکل اختیار کر جاتا ہے

اسی سورۃ کے اندر ذرا آگے جا کر یہ بتایا ہے کہ وَ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا قَرْيَةً (16:112) خدا مثال کے ذریعے تمہیں بات سمجھاتا ہے کہ ایک بستی تھی۔ كَانَتْ اٰمِنَةً مُّطْمَئِنَّةً (16:112) ان کو امن بھی نصیب تھا، اطمینان بھی نصیب تھا۔ امن تو بیرونی خطرات سے ہوتا ہے۔ اطمینان تو قلب کے اطمینان سے ہوتا ہے۔ انہیں یہ دونوں ہی چیزیں میسر تھیں، نہ خوف تھا، نہ حزن تھا۔ ان کی کیفیت یہ تھی کہ يَّاْتِيْهَا رِزْقُهَا رَغَدًا مِّنْ كُلِّ مَكَانٍ (16:112) چاروں طرف سے نہایت بافراط رزق ان کی طرف چلا آتا تھا۔ اس قوم کی یہ کیفیت تھی۔ پھر کیا ہوا؟ ہوا یہ کہ فَكَفَرَتْ بِاَنْعُمِ اللّٰهِ (16:112) انہوں نے خدا کی ان نعمتوں کا کفران کیا۔ کفران کا مادہ (Root) ''ک ف ر'' ہے۔ اسی سے کفر ہے۔ اس کے معنی ہوتے ہیں ''کسی چیز کو ڈھانپ کے رکھ لینا۔'' چھپا کے رکھ لینا۔ انہوں

---

❶ تاج العروس اور محیط المحیط

❷ تاکہ تم اس کے قانونِ ربوبیت کے سامنے جھک جاؤ۔

نے ان نعمتوں کو عالمگیر ربوبیت کا ذریعہ بنانے کی بجائے خود ہی چھپا کر رکھ لیا' تا کہ محتاجوں کو یہ نظر ہی نہ آئے' کسی کو دینا ہی نہ پڑے۔ انہوں نے اس سے یہ کیا۔ یہ ہے جسے کفرانِ نعمت کہتے ہیں۔ انہوں نے کفرانِ نعمت کیا۔ یہاں الفاظ آئے ہیں: بِاَنْعُمِ اللّٰہِ (16:112). یہ ہے وہی لفظ نعمت۔ تو نتیجہ کیا ہوا؟ وہ یہ بتایا کہ فَاَذَاقَھَا اللّٰہُ لِبَاسَ الْجُوْعِ وَ الْخَوْفِ (16:112) تو ان پر خوف اور بھوک کا عذاب مسلط ہو گیا۔ نعمتوں کے ملنے سے وہ آسائش کی زندگی تھی' نعمتوں کے چھننے سے خوف اور بھوک کا عذاب آ گیا ۔ یہ معلوم ہو گیا کہ بھوک اور خوف خدا کے عذاب ہیں۔ وہ اس لیے مسلط ہوتے ہیں کہ قوم خدا کی دی ہوئی ان نعمتوں کو عالم گیر ربوبیت کے لیے کھلا رکھنے کی بجائے اپنے ذاتی مفاد کی خاطر چھپا چھپا کر رکھتی ہے۔ یہ کفرانِ نعمت ہے۔ اس کا نتیجہ خوف اور بھوک کا عذاب ہے اور اگلے ہی الفاظ میں یہ آ گیا کہ یہ کیوں آیا۔ پہلے کہا تھا کہ یہ تمہیں اس لیے دے رہے ہیں تا کہ تم ہمارے قوانین کے مطابق ان کو صرف کرو' ایسا نظام بناؤ جو ہمارے قوانین و اصول کے مطابق ہو اور یہاں کہا کہ یہ اس لیے ہوا کہ بِمَا کَانُوْا یَصْنَعُوْنَ (16:112) یہ سب کچھ ان کے اپنے ہاتھوں کا لایا ہوا تھا۔ خدا نے اپنی بخششیں نہیں روک لی تھی' لیکن انہوں نے اپنے لیے جو غلط نظام قائم کیا' یہ اس کا نتیجہ تھا۔ وہ بخششیں قوانین خداوندی کے مطابق صرف کرنے کے بجائے ڈھانپ ڈھانپ کر رکھی جاتی تھیں تا کہ عامۃ الناس ''نوعِ انسانی'' کی ربوبیت کا وہ ذریعہ نہ بننے پائیں۔ یہاں یَصْنَعُوْنَ (16:112) بڑی عجیب چیز کے لیے آیا ہے۔

عزیزانِ من! ایک نظام تو حقیقی ہوتا ہے اور وہ خدا کے اصولوں کے مطابق قائم ہوتا ہے اور ایک نظام مصنوعی ہوتا ہے جو انسان اپنے قوانین کے تابع قائم کرتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اس میں یہ نعماء خدا کے ایک خاص طبقے کے اندر محدود ہو کر رہ جاتی ہیں۔ وہ ان کو ڈھانپتا ہے' چھپاتا ہے' محدود کر کے رکھتا ہے تا کہ عالم گیر انسانیت کے کام نہ آ سکے۔ نتیجہ اس کا خوف اور بھوک کا عذاب ہوتا ہے تو یہ دوسری بات نظر آ گئی کہ اس دنیا کی زندگی کی ضرورتیں اور ذرائع رزق کا باآسانی مل جانا اور بلا کسی احسان کے مل جانا' خدا کی نعمت ہے۔ یہ خدا کی نعمت کا چھن جانا' خدا کا عذاب ہے اور اس عذاب کی شکل خوف اور بھوک ہے۔

آگے چلیے' سورۂ لقمان میں اس اجمال کی اور تفصیل بیان کرتے ہیں یعنی اس دائرے کو وسیع تر کر دیا۔ اس کی وسعتیں حدود فراموش کر دیں۔ کس طرح سے؟ کہا کہ اَلَمْ تَرَوْا اَنَّ اللّٰہَ سَخَّرَ لَکُمْ مَّا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الْاَرْضِ (31:20) تم نے کبھی اس پر بھی غور کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ زمین ہی نہیں' یہ آسمان کے کرّے بھی' تمہارے لیے تابع و تسخیر کر دیئے' خارجی کائنات کی ہر شے تمہارے لیے مسخر کر دی کہ تم فطرت کی قوتوں (Forces of Nature) کو اپنے کام میں لاؤ اور ان سے اپنا کام چلاؤ۔

'اسبغ'' کا قرآنی مفہوم نعمتوں کے دریا بہا دینا

کہا کہ یہ تو جو ہم نے تسخیر فطرت کہا ہے' یہ کا ہے کے لیے ہے؟ وَ اَسۡبَغَ عَلَیۡکُمۡ نِعَمَهٗ ظَاهِرَةً وَّ بَاطِنَةً [1] (31:20)۔ اس آیت میں لفظ اسبغ آیا ہے۔ اس کے معنی ہیں: دریا بہا دیئے۔ اس نے انہیں عام کر دیا۔ اس آیت کے معنی ہیں کہ خدا نے اپنی نعمتوں کے' ان نعمتوں کی جو نفع' بخشیاں ظاهرة و باطنة' ہیں' جو محسوس طور پر اس وقت تمہارے سامنے آ گئی ہیں وہ بھی' اور وہ بھی جو ابھی پردۂ کائنات کے پیچھے چھپی ہوئی ہیں' جو ابھی محسوس طور پر تمہارے سامنے نہیں آ ئیں' کے دریا بہا دیئے۔ خدا نے تمہیں اپنی نعمتوں کو بھرپور' کثرت اور فراوانی سے دیا۔

عزیزانِ من! چودہ سو سال پہلے کے انسانوں کو اور ان انسانوں میں سے بالخصوص عربوں کو کہ جن کا علم اس قدر محدود تھا' کہا جا رہا ہے کہ جسے ہم نے تسخیر فطرت کہا ہے' جسے ہم نے تسخیر ارض و سما کہا ہے' ان کے اندر کچھ تو وہ نعمتیں ہیں' جو اس وقت محسوس طور پر تمہارے سامنے آ گئی ہیں اور ابھی ان نعمتوں کا بحر بے کنار ہے جو ابھی تمہاری نگاہوں سے پوشیدہ ہے۔ جوں جوں فطرت کے ان رموز کے اوپر سے پردے اٹھتے چلے جائیں گے' وہ نعمتیں باطن سے ظاہر ہوتی ہوئی تمہارے سامنے آتی چلی جائیں گی اور عزیزانِ من! آپ نے دیکھا ہے کہ اس چودہ سو سال کے عرصے میں کتنی ایسی فطرت کی قوتیں' انسان کے محسوس دائرے کے اندر آ گئیں' جو اس سے پیشتر غیر مرئی (Invisible) غیر محسوس (Abstract) تھیں اور ان سے اس نے کس قدر فوائد حاصل کیے۔ کہا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی نعمتوں کے دامن کو اور زیادہ کشادہ و وسیع کر دیا۔ دیکھیے' یہ وسعتیں ابھی ختم نہیں ہوئیں۔ یہ تو بحر بے کنار ہیں' حدود فراموش ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے تسخیر فطرت کے لیے پوری کائنات کو قانون کی زنجیروں میں باندھ رکھا ہے

سورۂ ابراہیم میں ہے کہ اَللّٰهُ الَّذِیۡ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضَ وَ اَنۡزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخۡرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزۡقًا لَّکُمۡ (14:32) اللہ وہ ہے جس نے اس ارض و سمٰوات کو پیدا کیا' بعد میں اس سے پانی برسایا' اس سے قسم قسم کے پھل اور کھیتیاں اگائیں' اس میں تمہارے لیے رزق ہے۔ وَ سَخَّرَ لَکُمُ الۡفُلۡکَ لِتَجۡرِیَ فِی الۡبَحۡرِ بِاَمۡرِهٖ (14:32) اور تم دیکھتے نہیں ہو کہ پانی میں لوہے کی ایک سوئی بھی اگر پھینک دی جائے تو ڈوب جاتی ہے لیکن اس کا قانونِ تسخیر فطرت یہ ہے کہ ہزاروں من وزن کے

---

[1] مقصد اس سے یہ ہے کہ تمہاری نشوونما کے لیے جس قدر ساز و سامان کی ضرورت ہے' خواہ وہ محسوس اور مرئی اشیاء ہوں یا کائنات کے پردوں میں چھپی ہوئی قوتیں (Forces)' اسے نہایت کشادگی اور فراوانی سے بہم پہنچائے اور اس طرح تمہاری نشوونما کی تکمیل ہو جائے۔

لوہے کے جہاز کس طرح سے اس کے قانون کے مطابق بط کی طرح سطح بحر پر تیرتے پھر رہے ہیں اور ان میں تم اپنا سامان' یہاں سے وہاں اور وہاں سے یہاں لیے چلے جا رہے ہو' کس طرح اس نے ان چیزوں کو مسخر کیا!!

وَ سَخَّرَ لَکُمُ الشَّمْسَ وَ الْقَمَرَ دَآئِبَیْنِ (14:33) سورج اور چاند تک کو تمہارے لیے مسخر کر دیا ہے۔ وہ ایک مقررہ قاعدے کے مطابق برابر چلے جا رہے ہیں اور یہ اس لیے کر دیا کہ اس سے اس کی تسخیر آسان ہوتی ہے۔ آپ کسی پرندے کو' کسی جانور کو' پکڑنا چاہیں تو وہ کبھی ادھر نکل جاتا ہے اور کبھی اُدھر نکل جاتا ہے۔ اس کے پکڑنے میں بڑی دقت ہوتی ہے اور اگر کبھی کوئی ایسی صورت ہو کہ وہ کسی دوسرے راستے پہ جا ہی نہ سکے' ایک ہی راستے کے اوپر جا رہا ہو تو اس کی تسخیر آسان ہوتی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ چاند اور سورج بڑے عظیم القدر کرّے ہیں۔ سورج کا تو پوچھیے نہیں' زمین سے تیرہ لاکھ گنا بڑا کرّہ ہے اور اس قسم کے کرّے لاانتہا پڑے ہوئے ہیں۔ یہ سورج اور قمر کی تسخیر کے متعلق کہا کہ ان کی کیفیت یہ ہے کہ وہ اپنے راستے پر ہی چلتے جاتے ہیں' اِدھر اُدھر نہیں ہٹتے۔ اس لیے ان کا تسخیر کرنا بڑا آسان ہے۔

کائنات کے متعلق چودہ سو سال پہلے کے انکشافات

عزیزانِ من! چودہ سو سال پہلے تو کوئی کیا بتائے گا' آج کا سائنٹسٹ' جو اس وقت چاند پہ جا رہا ہے اور مریخ پہ جا رہا ہے' وہ اسی لیے جا رہا ہے [1] کہ یہ سارے کرّے ایک متعین راستے پر چل رہے ہیں' ورنہ اگر یہ ہو کہ یہاں اپنے حساب اور قاعدے کے مطابق یہ ایک راستہ لیں اور چل پڑیں' اور جب آدھے راہ میں پہنچیں یا قریب پہنچیں تو وہ دوسری طرف نکل جائے' یہ اس کا پیچھا ہی نہیں کر سکتے۔ یہ ہے دَآئِبَیْنِ (14:33)۔ اور آگے کہا کہ وَ سَخَّرَ لَکُمُ الَّیْلَ وَ النَّھَارَ (14:33) دن اور رات کو مسخر کیا۔ وَاٰتٰکُمْ مِّنْ کُلِّ مَا سَاَلْتُمُوْہُ (14:34) اور جس قدر بھی تمہاری اس فزیکل لائف میں احتیاج اور ضروریات کی چیزیں تھیں' اس محسوس دنیا میں اپنی پرورش کے لیے جس جس چیز کی بھی تمہیں ضرورت تھی' اس نے تمہیں دیں۔

قدرت نے انسان کو کیا کچھ نہیں دیا اور اس نے پھر کیا کچھ نہیں کیا

کتنا کچھ دیا ہے؟ اس کے لیے سنیے کہ قرآن کریم کیا کہتا ہے وَ اِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَتَ اللّٰہِ لَا تُحْصُوْھَا (14:34) خدا کی نعمتوں

---

[1] ان کی کچھ تاریخ یون ہے کہ 4 اکتوبر 1957ء میں روس (سابقہ یو ایس ایس آر) نے اسپٹنک نامی مصنوعی سیارہ پہلی بار خلا میں بھجوا کر ایک عالم کو ورطۂ حیرت میں غرق کر دیا۔ 28 فروری 1959ء میں امریکا نے پہلا مخبر سیارہ خلا میں بھیجا۔ ہوا یوں کہ جب 2 دسمبر 1942ء کو ایٹم (Atom) توڑا گیا تو اس سے بے پناہ توانائی حاصل ہوئی یہ تسخیر چاند اور خلا اسی توانائی کا کرشمہ ہے۔

کو گننا چاہو تو تم انہیں گن نہیں سکتے۔ یہ سامانِ رزق ہم نے تمام انسانوں کی پرورش کے لیے دیا تھا لیکن انسانوں نے اسے اپنے قبضے میں لے کر ایسی دست درازیاں شروع کر دیں کہ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَظَلُوْمٌ کَفَّارٌ (14:34) ہر ایک دوسرے کے حقوق چھیننے لگا اور جو کچھ کسی کے ہاتھ آیا' اسے دبا کر بیٹھ گیا۔ جب تک یہ قومیں تیرے متعین کردہ راستے پر چلتی رہیں' زندگی کی شادابیوں سے بہرہ یاب رہیں۔ جب ان کے نظریہ حیات میں تبدیلی آ گئی تو یہ نعمتیں ان سے چھن گئیں اور وہ دنیا میں ذلیل وخوار ہو گئیں۔ ان کی سعی وعمل کی کھیتیاں جھلس کر راکھ کا ڈھیر بن گئیں اسی لیے اس سے بچنے کے لیے کہا کہ غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْھِمْ وَ لاَ الضَّآلِّیْنَ (1:7)۔ عزیزانِ من! یہ بات آگے جا کر میں عرض کروں گا کہ نعمتوں کے چھننے کے بعد کسی قوم کی کیفیت کیا ہوتی ہے۔

خدا کی طرف سے ان پیدا کردہ نعمتوں کا حصول آخر کس طرح ممکن ہوگا

اب سوال یہ ہے کہ خدا کی نعمتیں ملتی کس طرح ہیں؟ یعنی خدا نے ان کو مخلوق کے فائدے کے لیے پیدا تو کر دیا ہے' کرّہ ارض کے دستر خوان پر ان کو بچھا دیا ہے' لیکن یہ ملتی کس طرح سے ہیں اور کن کو ملتی ہیں؟ کیا ایسے ہی بیٹھے بٹھائے مل جاتی ہیں' یونہی مفت میں بلا محنت کے مل جاتی ہیں' بلا مشقت کے مل جاتی ہیں' بغیر کچھ کام کیے ہوئے مل جاتی ہیں؟ جواب میں کہا کہ نہیں' ایسے نہیں ملتیں۔ سورۃ الزمر میں یوں تو الجنۃ کے اعتبار سے بات کہی گئی ہے لیکن میں آگے چل کر عرض کروں گا کہ اخروی زندگی کی جنت پر ہمارا ایمان ہے لیکن جنت صرف اخروی زندگی ہی میں نہیں ملتی۔ جن نعمتوں کا ذکر خدا نے جنت کے حوالے سے کیا ہے' اس دنیا میں ان نعمتوں کے میسر آ جانے' دنیا میں اس پہ صرف قوانینِ خداوندی کے نظام کے قائم ہو جانے اور اس کے تابع زندگی گزارنے کو بھی قرآن جنت کی زندگی قرار دیتا ہے۔ کہا ہے کہ جنت کی زندگی کے اندر جو نعمتیں میسر ہوں گی' انہیں ملنے کے بعد' ان سے متمتع ہونے کے بعد' وہ قوم یہ کہے گی کہ وَ قَالُوا الْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ صَدَقَنَا (39:74) وہ کہیں گے کہ مستحقِ حمد یت خدا کی ذات ہے کہ جس نے اپنے وعدوں کو پورا کیا۔ جو کچھ وہ کہتا تھا کہ یہ ''کرو گے تو یہ ملے گا'' وہ سب کچھ ہمیں ملا۔ وَ اَوْرَثَنَا الْاَرْضَ نَتَبَوَّاُ مِنَ الْجَنَّۃِ حَیْثُ نَشَآءُ [1] (39:74)۔ ہمیں وہ خطہ زمین عطا کر دیا' وہ مملکت عطا کر دی جہاں ہمیں کلی اختیار حاصل ہے' جہاں ہمیں کامل آزادی حاصل ہے۔ ہمیں یہ کچھ ہے عطا کر دیا اور آگے ہے کہ فَنِعْمَ اَجْرُ الْعٰمِلِیْنَ (39:74) کام کرنے والوں کا بدلہ کتنا انعام والا ہے' کتنی بڑی نعمت والا ہے' کتنا بڑا اچھا ہے! یہ نعم ہے۔ اسے اجر العاملین کہا ہے یعنی کام کرنے والوں کے کام کا اجر ہے۔ تو یہ کام کے اجر کے طور پہ ساری نعمتیں حاصل ہوتی ہیں اور کام بھی پھر ایسا نہیں ہے کہ یونہی اطمینان سے' آرام سے ایک فیکٹری کے اندر بیٹھے ہوئے' دکان کے اندر بیٹھے ہوئے' دفتر کے

---

[1] اور ہمیں دنیا میں مملکت اور حکومت عطا ہو گئی (24:55;33:27) اور ہمیں اس میں ایسی آزادی مل گئی کہ ہم اس میں جہاں چاہیں رہ سکیں۔ (مفہوم القرآن)

اندر بیٹھے ہوئے‘ اس طرح سے ان کاموں سے مل جائے۔

قدرت کی نعمتوں سے لطف اندوز ہونے کی خاطر متواتر تگ وتاز کرنا ہوگی

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ کام بھی ضروری ہیں لیکن اس اصول جنت کے راستے میں تو بڑی بڑی دشوار گھاٹیاں آتی ہیں‘ بڑے خطرات کے میدان آتے ہیں‘ ایسے خطرات کے میدان کہ جان تک چلی جاتی ہے۔ قرآنِ کریم کہتا ہے کہ ان کی زندگی میں ایسا وقت بھی آ جاتا ہے کہ اَلَّذِیْنَ قَالَ لَھُمُ النَّاسُ اِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوْا لَکُمْ (3:173) یہ وہ لوگ ہیں کہ جب لوگوں نے ان سے کہا کہ تمہیں کچھ معلوم ہے کہ تمہارے مخالفین نے تم پر چڑھائی کرنے کے لیے‘ تمہارے مقابلے کے لیے‘ کتنا بڑا لشکر جمع کر رکھا ہے۔ تمہیں اس کا کچھ علم بھی ہے؟ فَاخْشَوْھُمْ (3:173) اس سے خوف کھاؤ‘ اس سے ڈرو کہ انہوں نے اتنا بڑا اجرار لشکر تمہارے مقابلے کے لیے‘ اکٹھا کر دیا ہے‘ یہ خبر سن کر فَزَادَھُمْ اِیْمَانًا (3:173) ان کے ایمان میں اور اضافہ ہوگیا: بجائے اس کے کہ اس سے وہ خوف کھاتے‘ ہمت ہار دیتے‘ ان کا ایمان اور بڑھ گیا۔ وَ قَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰہُ وَنِعْمَ الْوَکِیْلُ [1] (3:173)۔ انہوں نے کہا کہ اگر انہیں اپنے اور اپنے لاؤ لشکر پر‘ ساز وسامان پر اتنا بڑا فخر اور بھروسہ ہے‘ تو ہمیں بھی اللہ پر بھروسہ ہے۔ ہمارا قوانین خداوندی کی محکمیت پر ایمان ہے اور ہمیں اس پر ایمان ہے کہ جو حق وصداقت کی علم بردار قوم کے ہاں اگر ساز وسامان کی کچھ کمی بھی ہو‘ افراد کی کچھ قلت بھی ہو‘ تو اس کے قوانین اور ضابطے کا اتباع اس کمی کو پورا کر دیا کرتا ہے۔ ہمیں اس لیے اس کے قوانین پہ پورا پورا بھروسہ ہے۔ یہ نِعْمَ الْوَکِیْلُ (3:173) ہے اور بھروسے کا یہ سامان اتنا اچھا ہے جو ہمارے پاس موجود ہے۔ یہ کہہ کر وہ آگے بڑھے اور کہا کہ فَانْقَلَبُوْا بِنِعْمَۃٍ مِّنَ اللّٰہِ وَ فَضْلٍ لَّمْ یَمْسَسْھُمْ سُوْٓءٌ (3:174) وہ اللہ کی نعمتوں کی جھولیاں بھر بھر کر میدان جنگ سے واپس لوٹے‘ انہیں کسی قسم کا نقصان نہ ہوا‘ انہیں کوئی تکلیف نہ اٹھانی پڑی۔ وہ اس لیے کہ وَّ اتَّبَعُوْا رِضْوَانَ اللّٰہِ (3:174) انہوں نے اتباع کیا انہوں نے وہ راستہ اختیار کیا جو خدا کا پسند کیا ہوا راستہ تھا۔ اور اس طرح فَانْقَلَبُوْا بِنِعْمَۃٍ مِّنَ اللّٰہِ (3:174) وہ اللہ کی نعمتوں سے جھولیاں بھر بھر کر آئے۔ وَ اللّٰہُ ذُوْ فَضْلٍ عَظِیْمٍ (3:174) اس کے پاس بہت ساز وسامان ہے تو اس کے ذخیرے میں کوئی کمی نہیں آ جاتی۔ اتنا کیا اتنے سے زیادہ بھی اگر کوئی لے جائے یا ہم ان کو دے دیں تو ان میں کبھی کمی نہیں آتی۔ ہماری نعمتیں تو‘ جیسے کہا ہے‘ لا انتہا واقع ہوئی ہیں۔

---

[1] اور وہ دل کے پورے اطمینان سے کہتے ہیں کہ دشمن کا لشکر بڑا ہے تو ہوا کرے‘ ہمارے ساتھ قانونِ خداوندی کی تائید ونصرت ہے اور یہ وہ قوت ہے جس کے بعد کسی اور قوت کی حاجت نہیں رہتی‘ اور جس پر پورا پورا بھروسہ کیا جا سکتا ہے۔ (مفہوم القرآن)

قرآنی نظام اور سیکولر نظام میں ایک بنیادی فرق ہے

عزیزانِ من! آپ نے دیکھا کہ یہ نعمتیں ملتی کس طرح سے ہیں۔اس مقام پر دنیا کے سیکولر نظام اور نظامِ خداوندی میں ایک بنیادی فرق سامنے آتا ہے۔نظام کے معنی یہ ہیں کہ انسان' انسانوں کی جماعت' پارٹی' قوم گروہ' اپنے بنائے ہوئے قوانین کے تابع' ایک نظام قائم کرتا ہے' نعمتیں حاصل کرنے میں بھی' وہ اقدار وقوانین خداوندی کی پرواہ نہیں کرتا' سلب اور نہب سے' ظلم اور ستم سے ' کمزوروں اور غریبوں کی' ہر متاع کو چھین کر لے جاتا ہے۔

دانا ایں می کارد آں حاصل برد

زمین میں بوتا یہ ہے' فصل وہ کاٹ کے لے جاتا ہے۔

امتے بر امتے دیگر چرد

ہر قوم کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنے کھیت سے نہ چرے' دوسرے کے کھیت سے چرے' اور کیفیت یہ ہوتی ہے کہ

دانا ایں می کارد آں حاصل برد

زمین میں بیج یہ بوتا ہے اور فصل وہ کاٹ کر لے جاتا ہے۔یہ تو ہے نعمتیں حاصل کرنے کا ان کا انتظام ہے۔اور اس کے بعد پھر جس طرح سے جی چاہے' اپنے مفاد کی خاطر' ان کو تصرف میں لائیں' استعمال کریں' نہ یہ کوئی پوچھنے والا کہ تم نے انہیں حاصل کیسے کیا' نہ کوئی یہ پوچھنے والا کہ تم نے انہیں استعمال کس طرح سے کیا۔اسے کہتے ہیں سیکولر نظام۔یہ ہے جسے آپ Sovereign State کہتے ہیں۔ اس کی Definition (تعریف) یہ ہوتی ہے کہ وہ Sovereign State ہے جو اپنا حساب کسی کو نہیں دیتی' اس کے اوپر کوئی ایسا نہیں ہوتا 'جو اس سے حساب مانگ لے' یہ پوچھ لے کہ تم نے کیسے لیا' کہاں سے لیا' کہاں صرف کیا؟ یہ جو Sovereignty (حاکمیت) کی آخری اتھارٹی ہے' وہ یہ ہے کہ اس میں کوئی پوچھنے والا نہیں ہوتا اور اس کے برعکس جو نظامِ خداوندی ہے' اس میں یہ سب نعمتیں حاصل ہوتی ہیں' ملتی ہیں' لیکن آخر الامر یہ سیکولر اسٹیٹ نہیں بنتی۔قرآنِ حکیم نے غلط نظام کے نتائج کو بڑی وضاحت سے بیان کیا گیا ہے۔سورۃ التکاثر میں اس غلط نظام کا انجام کچھ اس طرح بیان کیا کہ **لَتَرَوُنَّ الْجَحِيْمَ** o **ثُمَّ لَتَرَوُنَّهَا عَيْنَ الْيَقِيْنِ** (102:6-7) یہ وہ جحیم ہے جہاں انسان صلاحیتوں کو جھلسا دینے والی مار کو' اپنی آنکھوں سے دیکھیں گے۔اور پھر انہیں یقین ہو جائے گا کہ واقعی ہمارا غلط نظام' غلط عمل' جو غلط مسلک پر تھا' وہ کس قسم کی تباہی لے کر آیا ہے' وہاں وہ مجرموں کے کٹہرے میں کھڑے ہوں گے' زنجیریں پہنائی ہوئی ہوں گی' ان قوموں کو باز پرس کے لیے عدالت خداوندی میں حاضر کیا جائے گا۔

قرآنِ حکیم نے غلط نظام کے نتائج کو بڑی وضاحت سے بیان کیا ہے

عزیزانِ من! بات سمجھانے کا قرآن کا یہ انداز دیکھیے کہا کہ وہاں زنجیروں میں جکڑنے کے بعد پوچھا کیا جائے گا کہ ثُمَّ لَتُسْئَلُنَّ یَوْمَئِذٍ عَنِ النَّعِیْمِ (102:8) ان سے یہ پوچھا جائے گا کہ یہ جو نعمتیں تھیں، تم نے کس طرح حاصل کیں اور پھر ان کو استعمال کس طرح کیا؟ پوچھا جائے گا وہ جو تم اپنے متعلق سمجھتے تھے کہ ہمیں کوئی پوچھنے والا نہیں۔ ٹھیک ہے، اس دنیاوی زندگی کے اندر تو تم نے ایسا انتظام کر لیا تھا کہ تمہیں کوئی پوچھنے والا نہ ہو، لیکن تمہیں معلوم ہے کہ وہ خدا کا ایک قانونِ مکافاتِ عمل بھی ہے، جو تمہارے انتظامات سے بلند اور بالا ہے اور وہ خدا کا مکافاتِ عمل ہے، جس کی رو سے جسے ہم تباہی کہتے ہیں آتی ہے اور تباہی کے متعلق کہا کہ وہ ان سے پوچھے گا کہ یہ نعمتیں کیسے حاصل کیں، کہاں خرچ کیں۔ یہی ایک فقرہ تھا۔

حضرت عمر کے الفاظ میں خلافت کی تعریف

عزیزانِ من! جس میں حضرت عمرؓ (581-644/45AD) نے سمجھا دیا۔ اُن سے پوچھا گیا کہ استخلاف فی الارض یا خدا کی حکومت کسے کہتے ہیں؟ آپ نے کہا کہ جس میں یہ پوچھا جائے کہ کہاں سے کیسے لیا تھا اور کہاں صرف کیا تھا۔ یہ اس قدر جامع ہے کہ دو لفظوں کے اندر ساری بات بتا دی کہ نظامِ حکومت خداوندی کے اربابِ اقتدار کو حساب دینا ہوگا۔ یہ وہی ہیں جنہیں ہم ذمے دار کہیں گے، ان کی کیفیت یہ ہوگی کہ ایک ایک پائی کے متعلق یہ سمجھیں گے کہ ہمیں اس کا حساب دینا ہوگا، ہم سے ان کے متعلق پوچھا جائے گا۔ ان کی کیفیت مرزا اسداللہ خاں غالب (1797-1869) کے الفاظ میں یوں ہے کہ

اِک اِک قطرے کا مجھے دینا پڑا حساب
خونِ جگر ودیعتِ مژگانِ یار تھا

نعمتوں کا مل جانا، خدا کا فضل عظیم ہے۔ یہی وہ راستہ ہے جس کی دعا کی گئی تھی، تمنا کی گئی تھی لیکن نعمتوں کے ملنے کے بعد جو اگلا قدم ہے، وہ بڑا سخت ہے۔ پھر ایک ایک کے متعلق پوچھا جائے گا کہ انہیں خدا کے قوانین اور اقدار کے مطابق صرف کیا تھا یا نہیں تو جیسا میں نے شروع میں کہا تھا کہ منعم علیہ وہ قوم ہوگی، جنہیں یہ تمام نعمائے خداوندی حاصل ہوں اور وہ انہیں اقدارِ خداوندی کے مطابق صرف کرے گی۔ یہ جو تم سے پوچھا جائے گا، والی بات ہے، اس کے لیے سورۃ الانبیاء کی دو تین آیات میرے سامنے آ گئیں۔ جی نہیں چاہتا کہ اس قدر جامع، اس قدر بلیغ آیات، ذہن میں آئیں تو میں انہیں زبان پر لائے بغیر آگے بڑھ جاؤں اور آپ احباب کو اس میں شریک نہ کروں۔ کہا کہ وَ کَمْ قَصَمْنَا مِنْ قَرْیَۃٍ کَانَتْ ظَالِمَۃً وَّ اَنْشَاْنَا بَعْدَھَا قَوْمًا اٰخَرِیْنَ (21:11) کتنی ہی بستیاں تھیں

جن کو برباد کر دیا گیا اور ان کی جگہ دوسری قوموں نے آ کر لے لی۔ یہ کیوں کیا؟ اس لیے کہ کَانَتْ ظَالِمَةً (21:11) وہ ظالم تھیں ،ظلم اور استبداد کی بنا پر وہ تباہ و برباد ہو گئیں اور ان کی جگہ دوسری قوموں نے لے لی۔ ان تباہ و برباد ہونے والوں کی کیفیت کیا تھی؟ اس کے لیے کہا کہ فَلَمَّآ اَحَسُّوْا بَاْسَنَآ اِذَا هُمْ مِّنْهَا يَرْكُضُوْنَ ❶ (21:12)۔ یہاں بڑی عجیب بات قرآن کہہ گیا ہے۔ کہا کہ یہ تباہی یکا یک Over night (شباشب) نہیں آ جایا کرتی۔

مکافاتِ عمل کی گرفت انسانوں کے بنائے ہوئے قانون سے بالاتر بھی ہے اور مضبوط بھی

یہ تو قوموں کے غلط نظام کے تباہ کن نتائج' یا اثرات' آہستہ آہستہ مرتب ہوتے رہتے ہیں اور وہ بڑے غیر محسوس طور پر مرتب ہوتے رہتے ہیں: مِنْ حَيْثُ لَا يَشْعُرُوْنَ (39:25) ان کا بظاہر پتہ ہی نہیں چلتا کہ یہ تباہیاں مرتب ہو رہی ہیں۔ وہ قوم خوش ہو رہی ہوتی ہے' مگن ہو رہی ہوتی ہے' فخر کر رہی ہوتی ہے کہ ہمیں کون پوچھنے والا ہے۔ کہا کہ جب ان کی اس غلط روش کے غیر محسوس نتائج 'آہستہ آہستہ' اس مقام پہ پہنچے کہ جہاں ان کا جو نتیجہ تھا' وہ محسوس شکل میں ان کے سامنے آئے تو اِذَا هُمْ مِّنْهَا يَرْكُضُوْنَ (21:12) تو وہ وہاں سے بھاگ اٹھے کہ اس تباہی سے بچ جائیں۔

سنیے' عزیزانِ من! قرآن نے کیا نقشہ کھینچا ہے۔ کہا کہ وہ بھاگ رہے تھے اور پیچھے سے ہمارا قانونِ مکافاتِ عمل آوازیں دے رہا تھا کہ لَا تَرْكُضُوْا (21:13) مت بھاگو' تم بھاگ کر کہیں نہیں جا سکتے' رک جاؤ اور رک ہی نہیں جاؤ بلکہ وَ ارْجِعُوْٓا اِلٰى مَآ اُتْرِفْتُمْ فِيْهِ وَ مَسٰكِنِكُمْ (21:13) لوٹو' چلو واپس' وہی محلات کے اندر کہ جو تم نے سر بفلک تعمیر کیے ہوئے تھے' جن کی رنگینیاں ان کے خون کی سرخیوں سے آویزاں تھیں' چلو تم' ان میں کہ جن میں تم نے عیش سامانیاں اس طرح جمع کر رکھی تھیں' جن میں تم عیش وعشرت کی زندگی بسر کیا کرتے تھے' چلو: وَ ارْجِعُوْٓا (21:13) لوٹو' چلو' وہاں۔ کاہے کو چلو؟ وہاں کیا ہوگا؟ کہا لَعَلَّكُمْ تُسْئَلُوْنَ (21:13) تا کہ وہاں تم سے پوچھا جائے کہ یہ کہاں سے لیا تھا' یہ کیسے حاصل کیا تھا' یہ کس کے خونِ جگر کی محنت کا نتیجہ ہے۔ یہ کون سے محنت کش تھے' جن کے پسینے سے یہ بنیادیں کھڑی ہوئیں' جن کی ہڈیوں کے کچومر سے یہ چیزیں کامیاب ہوئیں۔

نعمتوں کا حاصل کرنا اگر مشکل ہے تو پھر ان کو قانونِ خداوندی کے مطابق صرف کرنا مشکل ترین ہے

کہا کہ تم سے پوچھا جائے۔ لَعَلَّكُمْ تُسْئَلُوْنَ o قَالُوْا يٰوَيْلَنَآ اِنَّا كُنَّا ظٰلِمِيْنَ (21:13-14). تباہی دیکھنے کے بعد جب

---

❶ (ان کی غلط روش کے نتائج' غیر محسوس طور پر مرتب ہوتے چلے جا رہے تھے۔ انہیں ان کے انجام سے آگاہ کیا جاتا تھا کہ وہ اس روش سے باز آ جائیں' لیکن وہ اس تنبیہ پر کان نہیں دھرتے تھے۔ چنانچہ وہ غیر محسوس نتائج' آہستہ آہستہ' آگے بڑھتے گئے' حتیٰ کہ) جب وہ محسوس طور پر سامنے آ گئے تو وہ لگے بھاگنے (7:182;16:26)۔ (مفہوم القرآن از پرویزؒ۔ ص729)

پوچھا جائے گا کہ کہاں سے لیا' تو وہاں اعتراف پہ مجبور ہو جائیں گے کہ ہاں!'' واقعی ہم نے ظلم کیا تھا' سلب ونہب سے یہ چیزیں حاصل ہوئیں تھیں''۔ یہ کہتے چلے جائیں گے لیکن جب تباہی سامنے آ جاتی ہے' جب یہ روش انجام تک پہنچ جاتی ہے تو اس وقت فَمَا زَالَتْ تِّلْکَ دَعْوٰھُمْ (21:15) وہ یہ پکارتے چلے جائیں گے' اس کا کچھ فائدہ نہیں ہوگا۔ وہ یہ چیختے چلے جائیں گے۔ اگلے الفاظ سنیئے عزیزانِ من! حَتّٰی جَعَلْنٰھُمْ حَصِیْدًا خٰمِدِیْنَ (21:15) تا آنکہ ان کی وہ بستیاں ایسے ہو جائیں گی' جیسے کٹا ہوا کھیت ہو جیسے بجھا ہوا شعلہ ہو۔ یہ ہے لَعَلَّکُمْ تُسْئَلُوْنَ [1] (21:13) نعمتوں کے مل جانے سے آدمی بڑا خوش ہوتا ہے لیکن اس کی جو ذمے داریاں ہیں ان کے احساس سے تو انسان کی کمر ٹوٹ جاتی ہے۔

اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ نعمتوں سے سرفراز ہونے والوں کی کیفیت اور ذمہ داریاں

عزیزانِ من! اب صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ (1:6) کی طرف آئیں۔ اس نعمتِ کبریٰ کی طرف آیئے کہ جس سے اس امت مسلمہ کے افراد خیر امت (3:109) بنے' یہ منتشر ذرے ایک چٹان بنے' وہ جن کے متعلق کہا کہ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ ط وَ الَّذِیْنَ مَعَہٗٓ اَشِدَّآءُ عَلَی الْکُفَّارِ رُحَمَآءُ بَیْنَھُمْ [2] (48:29) وہ جن کے متعلق اعلان کیا کہ وَ کَذٰلِکَ جَعَلْنٰکُمْ اُمَّۃً وَّسَطًا لِّتَکُوْنُوْا شُھَدَآءَ عَلَی النَّاسِ [3] (2:143). انہیں کہا گیا کہ یہ ہماری کتاب کے قوانین کے مطابق زندگی بسر کرنے کا نتیجہ تھا کہ تم اس طرح سے ایک امت واحدہ اور امت وسطیٰ بن گئے۔

یاد رکھو! تمہیں تاکید کی جاتی ہے کہ وَ اعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰہِ جَمِیْعًا (3:103) تم تمام کے تمام خدا کے اس سہارے کو تھامے رکھو' خدا کی اس کتاب کے ساتھ متمسک رہو' جمیعا رہو: انفرادی طور پہ نہیں' اجتماعی طور پر' ایک نظام کی حیثیت سے' جماعت کی حیثیت سے' ایک امت واحدہ کی حیثیت سے (جمیعا) اور آگے عزیزانِ من! جمیعا ہی صرف نہیں بلکہ وَّ لَا تَفَرَّقُوْا (3:103) فرقوں میں نہ بٹ جانا' پارٹیوں میں تقسیم نہ ہو جانا' ٹکڑے ٹکڑے نہ ہو جانا' گروہ گروہ نہ ہو جانا۔ اس لیے کہ قرآن کے بندھن کا مقصد یہ تھا کہ تمہارے تنکے ایک جگہ مضبوطی سے بندھے ہوئے رہیں۔ ''حبل'' اسی لیے کہا ہے۔ اسی حبل اللہ کے تمسک کا نتیجہ تھا کہ تم ایک امت واحدہ بن گئے تھے۔

---

[1] تا کہ تم سے پوچھا جائے کہ یہ کچھ کس کی محنت سے بنا تھا اور تمہارا اس پر کیا حق تھا؟ (102:8)۔ (مفہوم القرآن از پرویزؒ)

[2] محمد رسول اللہ اور آپ کے رفقائے کار کی کیفیت یہ ہے کہ یہ حق کے مخالفین کے مقابلہ میں چٹان کی طرح سخت ہیں' لیکن باہم دگر بڑے ہی نرم دل اور ہمدرد (5:54) (ایضاً)

[3] اور تمہیں ایک ایسی قوم بنا دیا جائے جسے تمام دنیا میں بین الاقوامی پوزیشن حاصل ہو۔ جس سے دنیا کی ہر قوم یکساں فاصلے پر ہو۔ وہ نہ کسی کی طرف جھکی ہوئی ہو' نہ کسی سے کھنچی ہوئی اور اس کا فریضہ زندگی یہ ہو کہ وہ تمام اقوامِ عالم کے اعمال کی محاسب ونگران ہو۔ (ایضاً)

خونی رشتہ تو صرف جسموں کو اکٹھا کرتا ہے جبکہ نظریاتی اور ایمانی قوت دلوں کو جوڑ دیتی ہے

یاد رکھو! اس کے ساتھ متمسک رہو گے تو یہ کیفیت ہوگی: جمیعا' اجتماعی طور پر' ولاتفرقوا' کہیں فرقوں میں نہ بٹ جانا اور اس کے بعد کہا کہ وَ اذْکُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰہِ عَلَیْکُمْ (3:103) خدا کی اس نعمت کو یاد کرو اِذْ کُنْتُمْ اَعْدَآءً (3:103) جب تم ایک دوسرے کے جانی دشمن تھے' جنہیں ہم مخاطب کر رہے ہیں۔ یہ کوئی پہلی نسل' پہلی قوم نہیں' تمہاری کیفیت یہ تھی کہ تم ایک دوسرے کے جانی دشمن تھے۔ فَاَلَّفَ بَیْنَ قُلُوْبِکُمْ (3:103) تو خدا نے یہی نہیں کہ تم میں ایک ظاہرہ قسم کی جماعتی زندگی کا اجتماعی نظام قائم کیا' تمہارے دلوں کے اندر ایک دوسرے کی محبت ڈال دی' اس نے تمہارے دلوں کو جوڑ دیا۔ ایمان کا رشتہ ایک ایسی شے ہے کہ وہ جسموں کو صرف اکٹھا ہی نہیں کرتا' وہ دلوں کو اکٹھا کرتا ہے۔ اس نے کہا کہ وَ اذْکُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰہِ عَلَیْکُمْ (3:103) تم ذرا اپنی پچھلی حالت کو یاد کرو جب تم اجتماعی زندگی کے بجائے' فرقوں اور گروہوں میں بٹے ہوئے تھے۔ تم ایک دوسرے کے جانی دشمن تھے' خدا نے اس حالت میں تمہیں ایسا نظامِ زندگی عطا کیا۔ یہ خدا کی نعمت تھی کہ فَاَلَّفَ بَیْنَ قُلُوْبِکُمْ (3:103) تمہارے دل ایک دوسرے سے جڑ گئے۔ تمہارے دلوں کے اندر اس نے باہمی تالیف پیدا کر دی' باہمی جڑنے کی صلاحیت پیدا کر دی' اور اس طرح فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِہٖٓ اِخْوَانًا (3:103)۔ اور اس طرح اپنی نعمت کے صدقے سے تمہیں بھائی بھائی بنا دیا۔

عزیزانِ من! اللہ کی نعمت پر غور فرمایئے کہ تم پہلے ایک دوسرے کے دشمن تھے تمہارے دلوں کو جوڑ دیا۔ یہ اللہ کی نعمت ہے کہ اس نے تمہیں بھائی بھائی بنا دیا۔ کہا کہ تمہاری کیفیت کیا تھی؟ وَ کُنْتُمْ عَلٰی شَفَا حُفْرَۃٍ مِّنَ النَّارِ (3:103) تو تباہی اور بربادی کے جہنم کے کنارے تک پہنچ چکے تھے۔ فَاَنْقَذَکُمْ مِّنْھَا (3:103) ہم تمہیں وہاں سے کھینچ کے واپس لائے۔ ہماری نعمت نے اس جہنم سے تمہیں بچایا' خیر امت بنایا' امت واحدہ بنایا' دنیا بھر میں ''اعلون'' کا مقام عطا فرمایا۔ یہ خدا کی نعمت تھی۔ کیسے حاصل ہوئی تھی؟ صرف حبل اللہ کے تمسک کے ذریعے سے۔ قرآنِ کریم کے اتباع کے ذریعے اور وارننگ دی کہ یاد رکھو! کہیں فرقوں میں نہ بٹ جانا' ٹکڑے ٹکڑے نہ ہو جانا۔ کَذٰلِکَ یُبَیِّنُ اللّٰہُ لَکُمْ اٰیٰتِہٖ لَعَلَّکُمْ تَھْتَدُوْنَ (3:103) اس طرح سے خدا اپنی آیات کو نہایت واضح طور پر بیان کرتا ہے تاکہ زندگی کا صحیح راستہ تمہارے سامنے آ جائے۔ تم نے کہا تھا کہ اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ (1:5) یہ اس لیے ہے کہ لَعَلَّکُمْ تَھْتَدُوْنَ (3:103) اکہ تم صحیح راہنمائی کے اوپر چلو۔ آپ نے غور فرمایا' عزیزانِ من! کہ خدا کی یہ نعمت کون سی تھی؟ یہی ہے وہ سب سے بڑی نعمت' عزیزانِ من! کہ جس کے تابع تمام نعمتیں آ جاتی ہیں: ''حبل اللہ کے تمسک کے ذریعے امت واحدہ''۔ اس بات کو سن رکھیے' میں یہ باتیں اس وقت کہہ رہا ہوں کہ جب میں زندگی کے آخری دور میں پہنچ رہا ہوں۔ اس لیے ممکن ہے کہ یہ چیزیں کہنے کا پھر موقع نہ ملے۔

اسلام امت واحدہ کا نام ہے جبکہ فرقوں میں بٹ جانا شرک عظیم

میں یہ عرض کردوں کہ اسلام نام ہے امت واحدہ کا۔ امت واحد بنتی ہے' خدا کی کتاب قرآنِ کریم کے ساتھ تمسک سے۔ یہی حبل اللہ ہے' اسی سے ان کی جمعیت ہوتی ہے۔ اگر امت' امت واحد نہیں رہی' تو اس میں اسلام نہیں رہتا۔ اگر یہ فرقوں میں بٹ جاتی ہے' ان میں تفرقہ آ جاتا ہے' یہ پارٹیوں میں بٹ جاتی ہے' مختلف مملکتیں بن جاتی ہیں' مختلف قومیں بن جاتی ہیں تو امتِ واحدہ نہیں رہتی ۔سن رکھیے کہ اسلام نہیں آ سکتا جب تک یہ امت واحدہ نہ بن جائے اور امت واحدہ بننے کا ذریعہ صرف قرآن نے بتایا ہے: ''حبل اللہ کے ساتھ تمسک رکھنا''۔ پہلے بھی یہ اسی قرآن کے ذریعے امت واحدہ بنی تھی' اب بھی یہ اسی کے ذریعے امت واحدہ بن سکتی ہے۔ کہا کہ یاد رکھنا' یہ ہے ان تمام نعمتوں کے ملنے کی بنیاد۔ یہ اجتماعی نظام' امت واحدہ' قرآن سے تمسک' اس کے مطابق زندگی کے ہر شعبے کے اندر فیصلے دینا ہے' تو یہ امت واحدہ کی کیفیت ہے' خدا کی طرف سے نعمتیں ملنے کی کیفیت ہے۔

ذرا سورۃ الفاتحۃ کے ایک ٹکڑے سے پیچھے چلیے۔ اِیَّاکَ نَعْبُدُ (1:4) اور پھر اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ (1:4) پھر اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ (1:5) اس کے بعد ہے۔ صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ (1:6).

''ایاہ تعبدون'' کا عملی ثبوت یہ ہے کہ خدا کی نعمتوں کو کھلا رکھا جائے

اِیَّاکَ نَعْبُدُ (1:4) ہم صرف تیری ہی محکومیت اختیار کیے ہوئے ہیں۔ کہا کہ وَّ اشْکُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰہِ اِنْ کُنْتُمْ اِیَّاہُ تَعْبُدُوْنَ (16:114)۔ تم نے کہا تھا اِیَّاکَ نَعْبُدُ (1:4) ہم صرف تیری محکومیت اختیار کرتے ہیں۔ کہا کہ اگر تم نے یہ صرف زبان سے نہیں کہا' اگر یہ حقیقت ہے کہ اِیَّاہُ تَعْبُدُوْنَ (16:114) واقعی تم اس کی محکومیت اختیار کرتے ہو تو پھر اس کا محسوس ثبوت یہ ہے کہ وَّ اشْکُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰہِ (3:102) جتنی نعمتیں خدا نے دی ہیں انہیں اس کے بتائے ہوئے اقدار اور اصول کے مطابق صرف کرو۔ اگر تمہارا یہ دعویٰ سچا ہے کہ تم صرف اسی کی محکومیت اختیار کیے ہوئے ہو' تو پھر تم پر خدا کی نعمتوں کا شکریہ واجب ہو جائے گا اور اگر شکریہ واجب ہو جائے گا تو پھر کیا ہوگا؟ اس کے لیے کہا کہ وَ اِذْ تَاَذَّنَ رَبُّکُمْ لَئِنْ شَکَرْتُمْ (14:7) خدا نے تمہارے لیے یہ اعلان کر دیا کہ اگر تم نے اس کی نعمتوں کو اس کے بتائے ہوئے اقدار کے مطابق صرف کیا تو نہ صرف یہ کہ وہی نعمتیں قائم رہیں گی بلکہ لَاَزِیْدَنَّکُمْ (14:7) ہم اور زیادہ بڑھاتے جائیں گے' ان نعمتوں میں اضافہ کرتے چلے جائیں گے۔ وَ لَئِنْ کَفَرْتُمْ اِنَّ عَذَابِیْ لَشَدِیْدٌ (14:7) اور اگر تم نے ان سے کفران برتا' ان کو ان طریقوں کے مطابق صرف نہ کیا' تو پھر ہمارا عذاب بڑا ہی سخت ہوا کرتا ہے۔

حذر اے چیرہ دستاں سخت ہیں فطرت کی تعزیریں

سورۃ فاتحہ کی آخری وہ آیت جس میں ہمیں اپنا چہرا دیکھتے ہوئے کچھا اپنا علاج بھی کرنا ہوگا

عزیزانِ من! آگے پھر آخری ایک آیت ہے جس حالت میں آج ہم ہیں۔ جب ہم آگے چلیں گے۔ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَ لَا الضَّآلِّيْنَ (1:7) تو ہم دیکھیں گے کہ بعینہٖ وہی آج ہماری کیفیت آ جائے گی۔ یہ خدا کا وہ معیار ہے جسے ہم استعمال کر کے دیکھ سکیں گے کہ ہم ہی مَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ ہیں۔ منعم علیہ نہیں ہیں۔ خدا کی کون سی نعمت ہم کو حاصل ہے' کوئی بھی نہیں اور یہ کہ اب ان حالات میں وہ نعمتیں حاصل کرنے کے لیے کیا کیا جائے؟ یہ بڑی اہم چیز ہے۔ یہی تو اصل بات ہے۔ دروس تو سارے سن لیے' وعظ بھی سارے سن لیے' قرآن بھی پڑھ لیا' سمجھ بھی لیا' سوال یہ ہے کہ خدا کی نعمت کو حاصل کیسے کیا جائے۔ اس کے لیے اس نے بتا دیا کہ یاد رکھو! ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ لَمْ يَكُ مُغَيِّرًا نِّعْمَةً اَنْعَمَهَا عَلٰى قَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ ۙ وَ اَنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ (8:53)۔ یہ بڑی اہم اور بنیادی آیت ہے۔ اس میں کہا گیا ہے کہ یاد رکھو! خدا کسی قوم سے اپنی دی ہوئی نعمتوں کو نہیں چھینتا تاوقتیکہ وہ قوم خود اپنے اندر ایسی تبدیلی نہیں پیدا کر لیتی۔ انسان کے اندر خارجی دنیا کا انقلاب اور تبدیلی داخلی نفسیاتی تبدیلی کا مظہر ہوتا ہے لہٰذا اگر تم موجودہ حالت میں جب کہ وہ نعمتیں تم سے چھن چکی ہیں' انہیں حاصل کرنا چاہتے ہو تو اپنے اندر نفسیاتی تبدیلی پیدا کرو۔

اب سوال یہ ہے کہ اس نفسیاتی تبدیلی کے معنی کیا ہیں۔ اس کے لیے پہلے یہ سمجھو کہ خدا کے اقدار و اصول و احکام کون سے ہیں۔ انہیں اچھی طرح سے ذہن نشین کرو' پھر انہیں دل کی گہرائیوں میں اتارو۔ اب اگلا سوال یہ ہے کہ دل کی گہرائیوں میں اتارنے کے معنی کیا ہیں؟ آپ پہلے کسی کتاب سے پڑھ کے' حکیم سے پوچھ کے' لوگوں سے سن کے' یہ معلوم کر لیتے ہیں کہ سنکھیا ہلاکت آفرین ہے 'مہلک ہے' اس سے انسان مر جاتا ہے۔ یہ آپ نے ذہنی طور پہ سمجھا ہے اور اس کے بعد پھر آپ اسے اپنے دل کی گہرائی میں لے جاتے ہیں کہ اگر میں نے سنکھیا کھا لیا تو میری ہلاکت ہو جائے گی۔ اس سے آپ کے اندر یہ ایک تبدیلی پیدا ہوتی ہے کہ مجھے سنکھیا نہیں کھانا چاہیے۔ صرف قرآن کے یہ پیغامات اور اس کے اقدار اور اس کے وعظوں کو سننا اور ذہنی طور پہ کہنا کہ ''سبحان اللہ'' کیا بات ہے صاحب! یوں کہیے قرآن کی یا یہ کہہ لیجیے کہ پرویز صاحب! کس طرح قرآن کے حقائق کو سمجھاتے ہیں! ذہنی طور سے تو آپ اس سے مطمئن اور خوش ہو جائیں گے لیکن یہ دل کے اندر اترنے والی بات نہیں ہوگی۔ دل کے اندر اترنے والی بات اس وقت ہوگی جب آپ کے اپنے اندر یہ تبدیلی پیدا ہو کہ اگر میں نے اپنے ہی جذبات کے ماتحت زندگی بسر کی' تو میں تباہ ہو جاؤں گا اور اگر میں اس تباہی سے بچنا چاہتا ہوں تو اس کی ایک ہی شرط ہے' ایک ہی ذریعہ ہے کہ میں خدا کے اقدار کے مطابق اپنے اندر ایک تبدیلی پیدا کر لوں۔ یہ تبدیلی پیدا ہوگی تو پھر خدا کی چھنی ہوئی نعمتیں واپس مل سکیں گی۔

قوم کے اندر یہ تبدیلی پیدا کرنا' عزیزانِ من! میں نے اپنی زندگی کا مشن قرار دیا ہے کیوں؟ اس لیے کہ نبی اکرم ﷺ کے متعلق

بھی قرآن کریم میں یہی بتایا گیا ہے کہ یُعَلِّمُھُمُ الْکِتٰبَ وَ الْحِکْمَۃَ وَ یُزَکِّیْھِمْ(2:129) آپ کتاب کی‘ قرآنِ کریم کی‘ انہیں علیٰ وجہ البصیرت تعلیم دیتے تھے‘ ان کو حکمت کی باتوں کی‘ اور قرآن کی تعلیم دیتے تھے اور اس کے بعد ان کی ذات کے اندر ایک تبدیلی پیدا کرتے تھے جس سے ان میں حیاتِ نو پیدا ہو جاتی تھی۔

خدا اور اس کے فرشتے صدیوں سے اسی انتظار میں ہیں کہ ہم اپنی حالت کب بدلتے ہیں

آج بھی یہی طریقہ ہے‘ کہ عزیزانِ من! قرآن کی اقدار کی تعلیم اس انداز سے دی جائے کہ انسان دل کی گہرائیوں تک میں محسوس کرنے لگ جائے کہ واقعی اس کے مطابق زندگی بسر کرنے سے مجھے زندگی مل سکتی ہے۔ اگر میں نے اس کی خلاف ورزی کی تو پھر میری تباہی یقینی ہے۔ عزیزانِ من! ان تفصیلات سے آپ سن لیجیے کہ جب ہم کہتے ہیں اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ (1:6) اور پھر اس کے بعد کہتے ہیں کہ صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ (1:7) جن پہ تو نے اپنا انعام کیا تھا‘ تو قرآن کس طرح تفصیلاً بتاتا ہے کہ ہمارے انعامات ہیں کیا؟ جن قوموں کو یہ ملتے ہیں‘ ان کی کیفیت کیا ہوتی ہے‘ جن سے یہ نعمائے خداوندی چھن جاتی ہیں‘ ان کی حالت کیا ہو جاتی ہے؟ پھر اس کے لیے جو اگلے الفاظ ہیں‘ جو قرآن کی اگلی آیت ہے‘ اس کا انتظار کیجیے۔ وہ آیت ہے: غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْھِمْ وَ لَا الضَّآلِّیْنَ (1:7) ۔ اسے ہم آئندہ درس میں لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ط

❀.....❀❀.....❀

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

غلام باری، مانچسٹر

عبادت واطاعت اور الٰہ کا مفہوم

یہ ایک بہت بڑا قابلِ غور وفکر فریب ہے کہ عربی زبان کے لفظ عبادت کو صرف پرستش (Worship) ' لفظ الٰہ کو صرف ایسا معبود (god) جس کی پرستش کی جائے اور اطاعت کو حدیث کے اتباع کے معنی پہنا کر مسلمانوں کی دنیاوی زندگی تباہ و برباد کر کے قوم پر ہمیشہ کے لئے جمود طاری کر دیا گیا۔ قوموں کی موت و حیات یعنی زوال و عروج نظام سے وابستہ ہے۔ عنوانِ بالا کے تینوں الفاظ کا نظام سے گہرا تعلق ہے۔

عبد کے معنی غلام اور محکوم کے ہوتے ہیں۔ اس لئے عبادت کے معنی ہوئے کسی کی محکومی اور اطاعت اختیار کرنا۔ دین کی بنیاد اس اصولِ محکم پر ہے کہ اطاعت اور محکومیت خدا یعنی قوانینِ خداوندی کے سوا اور کسی کی نہیں ہو سکتی۔ اسی کا نام خدا کی عبادت ہے یعنی ہر معاملہ میں قوانینِ خداوندی کی اطاعت کرنا۔ ظاہر ہے اجتماعی طور پر احکام و قوانین کی اطاعت کے لئے ایک نظام کی ضرورت ہے۔ اس نظام کو دین کہا گیا ہے۔ اس نظام کی مرکزی اتھارٹی کی اطاعت، خدا (یعنی قوانین خداوندی) کی اطاعت ومحکومیت ہے۔ جب دین، مذہب میں تبدیل ہو جاتا ہے تو عبادت سے مراد پرستش ہو جاتی ہے۔ ہمارے ہاں جب یہ کہتے ہیں کہ وہ بڑا عبادت گذار ہے تو سب کے ذہن میں ایک خاص تصور آتا ہے کہ وہ ساری ساری رات نفل پڑھتا ہے۔ ورد و وظائف اور تسبیح کرتا ہے۔ یہ مذہب کی دنیا میں پرستش کا تصور ہے، عبادت کا نہیں۔ عبادت کا تصور تو خدا کی محکومیت میں ہے۔۔۔۔۔ صحیح مسلم کی حدیث نمبر ۱۰۶۲ کے جز میں ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ: مجھے! منزلِ مقصود پر پہنچانے والے بلیغ اور وسیع المعنی الفاظ دیئے گئے ہیں۔ لہٰذا قرآن کریم میں جہاں لفظ عبادت خدا کے لئے آیا ہے وہاں اس کے معنی خدا کی محکومیت و اطاعت کے ہیں۔ لیکن جہاں یہ لفظ کفار اور مشرکین کے سلسلہ میں آیا ہے تو وہاں (ان کے تصور کی رو سے) اس سے مراد پرستش ہو گی۔ اس لئے کہ وہ اپنے معبودوں کی پرستش کرتے تھے۔ اور اس کے لئے یہی لفظ بولتے تھے۔ قرآن نے ان مقامات میں اس لفظ کو انہی کے مفہوم میں استعمال کیا ہے۔ انبیاء کرامؑ پرستش اور، پوجا پاٹ

کے لئے نئے نئے طریقے بتانے کے لئے نہیں آیا کرتے تھے۔ انہیں ایک نظام کو الٹ کر اس کی جگہ خداوندی نظام قائم کرنے کے لئے بھیجا گیا تھا۔ اس لئے ہر رسول کی مخالفت ہوتی تھی۔ قرآن کریم میں ہے کہ فرعون نے قومِ بنی اسرائیل کو اپنا عبدت (محکوم) بنا لیا تھا (۲۶/۲۲)۔ اور قومِ فرعون نے موسیٰ علیہ السلام اور ہارون علیہ السلام کے متعلق کہا کہ کیا ہم ان دو آدمیوں پر ایمان لے آئیں جو ہماری ''قومِ عابدین'' (محکوم قوم) میں سے ہیں (۲۳/۴۷)۔ ان دو ہی آیات سے عبادت کا مفہوم (محکومیت واطاعت) واضح طور پر نکھر کر سامنے آجاتا ہے۔

دینِ اسلام کے صدرِ اول کے بعد روایات کے ذریعے مذہبی عبادات کو جنت میں داخل ہونے کا ذریعہ بنا دیا گیا ہے (۲/۲۱۴) جبکہ عبادت کا مطلب محض قولی اور نمائشی اقرار نہیں بلکہ احکام وقوانینِ خداوندی پر صدقِ دل سے عمل پیرا ہونا ہے۔ دورِ حاضر کے مسلمانوں کا فہمِ دین صحیح نہیں ہے اس لئے وہ توحید کے بلند بانگ زبانی اقرار کے باوجود بہت بڑے بت پرست بن چکے ہیں۔ خدا کے متوازی انسانوں کی اطاعت ومحکومیت بت پرستی اور شرک نہیں تو اور کیا ہے؟ حالانکہ سب رسولوں کا یہی پیغام تھا کہ أَنِ اعْبُدُواْ اللّهَ وَاجْتَنِبُواْ الطَّاغُوتَ (۱۶/۳۶)۔ خدا کی محکومیت اختیار کرو اور ہر غیر خداوندی اقتدار کی محکومیت اور فرماں پذیری سے باز رہو۔ أَنِ اعْبُدُوا اللَّهَ وَاتَّقُوهُ وَأَطِيعُونِ۔ حضرت نوح علیہ السلام نے کہا کہ (اگر تم تباہی سے بچنا چاہتے ہو تو) خدا کی محکومیت اختیار کرو اور اس کے قوانین کی نگہداشت کرو۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ تم میری (حکومتِ خداوندی کے اولین سربراہ کی) اطاعت کرو۔ اور رسول اللہ ﷺ نے قوانینِ خداوندی سے انکار کرنے والوں کو فرمایا کہ لَا أَعْبُدُ مَا تَعْبُدُونَ O وَلَا أَنتُمْ عَابِدُونَ مَا أَعْبُدُ O (الکفرون)۔ تمہاری اور میری منزل بھی الگ الگ ہے اور راستے بھی جُدا جُدا۔ مقصود بھی الگ ہے اور اسے حاصل کرنے کے ذرائع بھی الگ۔ تمہارے معبود الگ ہیں' میرا معبود الگ۔ تم عبادت سے کچھ اور مفہوم لیتے ہو میں کچھ اور۔ تم اپنے معبودوں کی پرستش کرتے ہو' میں اپنے معبود کے احکام وقوانین کی اطاعت کو اس کی عبادت سمجھتا ہوں۔ سورہ الانبیا میں ہے کہ: إِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُونَ مِن دُونِ اللَّهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ۔ تم اور تمہارے وہ اربابِ اقتدار جن کی تم' قوانین خداوندی کو چھوڑ کر محکومی واطاعت اختیار کئے تھے سب کے سب جہنم کا ایندھن ہو۔

خدا کا ارشاد ہے کہ: وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ O مَا أُرِيدُ مِنْهُم مِّن رِّزْقٍ وَمَا أُرِيدُ أَن يُطْعِمُونِ O جن وانس کی تخلیق کا مقصد یہ ہے کہ قوانینِ خداوندی کی محکومیت یعنی اطاعت سے اپنی صلاحیتوں کی نشوونما کریں (اور انہیں نوعِ انسانی کی پرورشِ عامہ کے لئے وقف کر کے عالمگیر نظامِ ربوبیت قائم کریں) اس نظام

کی تشکیل سے' خدا کا کچھ فائدہ نہیں۔ تمہارا اپنا ہی فائدہ ہے۔ خدا بندوں سے (تمہارے باطل معبود و مترفین یعنی بادشاہ' ڈکٹیٹر' ممبرز آف پارلیمنٹ اور مذہبی پیشواؤں کی طرح) کچھ نہیں چاہتا۔ نہ اسبابِ زیست اور نہ سامانِ خورو نوش۔ اس کے برعکس مذہبی پیشواؤں نے اپنی من گھڑت بات کو حدیث قدسی ٹھہرایا اور اسے حضورﷺ کے نام سے منسوب کر کے کہا! ''خدا نے فرمایا'' انہوں نے آیت کریمہ میں لفظ عبادت کو معرفت کے معنی پہنا کر نیا چاند چڑھا دیا۔ یاللعجب۔ مفکرِ قرآن اقبالؒ نے ایسی روایات و تفسیر پڑھ کر کہا۔

زمن بر صوفی و مُلا سلامے
کہ پیغامِ خدا گفتند مارا
ولے تاویلِ شاں در حیرت انداخت
خدا و جبرئیل و مصطفیٰؐ را

قرآنِ کریم میں لفظِ عبادت کی طرح الٰہ کا لفظ بھی جہاں باطل پرستوں کے لئے استعمال کیا گیا ہے وہاں اس سے مفہوم مٹی یا پتھر کے جامد بت' دیوی دیوتا نیز چلتے پھرتے gods اور goddess ہیں۔ لیکن جہاں یہ لفظ اللہ کے لئے آیا ہے وہاں اس سے مراد ہے صاحبِ اقتدار۔ لہٰذا **لا الٰہ الا اللہ** کا مطلب ہے خدا کے سوا کوئی ایسی ہستی نہیں جسے اقتدار کا حق حاصل ہو۔ There is no Sovereign except Allah ہمارے ہاں کلمہ طیب کا ترجمہ خدا کے سوا کوئی معبود نہیں کر کے بچپن ہی سے ذہنوں میں راسخ کر دیا جاتا ہے اور اسی طرح انگریزی زبان میں There is no god but God ترجمہ کیا جاتا ہے۔ ان دونوں تراجم کی رو سے خدا کو پرستش تک محدود رکھ کر قوانینِ خداوندی کو فراموش کروا دیا جاتا ہے۔ کلمہ طیب جو ایک نظریۂ زندگی ہے۔ سورہ ابراہیم میں جس کی مثال خدا نے ہمیشہ خوشگوار پھل دینے والے شجرِ طیب سے دی تھی' دل پر ضربیں لگانے کا ڈگا بن کر رہ گیا۔ دیہاتوں میں ہاتھ دھوتے وقت پاکیزگی کے لئے کلمہ پڑھ کر اس سے صابن کا کام لیا جانے لگا۔ اگر کلمہ کا ترجمہ There is no God but Allah کیا جاتا تو پھر اور بات ہوتی۔ لا الٰہ الا اللہ۔ ان الحکم الا للہ ایک عظیم انقلابی تصور ہے۔ اس کا اقرار کرنے والا اس امر کا اعلان کرتا ہے کہ کائنات میں کوئی قوت ایسی نہیں جس کے سامنے جھکا جائے جس کی محکومی اختیار کی جائے۔ یہ حق صرف خدا کو حاصل ہے اور بس۔ چونکہ خدا سے ہمارا تعلق قرآن کریم کے ذریعے ہے۔ اس کے علاوہ اس کے ساتھ ہمارے تعلق کی کوئی صورت نہیں۔ لہٰذا خدا کی محکومیت و عبودیت سے مفہوم بھی یہی ہے کہ قرآن کریم کے قوانین و احکام کی حکومت قائم کر کے اس کے مطابق زندگی بسر کی جائے۔ سورہ بنی اسرائیل میں خدا کی طرف سے وارننگ دی گئی ہے کہ: وَلاَ تَجْعَلْ مَعَ اللّهِ إِلَهاً آخَرَ فَتُلْقَى فِيْ جَهَنَّمَ مَلُوماً مَّدْحُوراً۔ تم خدا کے سوا

کسی کی حاکمیت کو تسلیم نہ کرو۔ اطاعت اسی کے قوانین کی کرو۔ اس کے ساتھ کوئی اور صاحبِ اقتدار ہستی کو شریک نہ کرو۔ اگر تم ایسا کرو گے (یعنی خدا کے علاوہ کسی اور کو صاحبِ اقتدار تسلیم کرو گے) تو اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ تم (شرفِ انسانیت سے گر جاؤ گے اور) طرح طرح کی ملامتوں کے ساتھ دھتکارے ہوئے' جہنم کی تباہیوں میں گر جاؤ گے۔ ہماری یہ حالت نتیجہ ہے اس تنبیہہ کی خلاف ورزی کرنے کا۔

اطاعت کسی کے حکم یا فیصلے کو بطیّب خاطر ماننے کو کہیں گے۔ دین کی اصل و بنیاد اس حقیقت پر ہے کہ کسی انسان کو حق حاصل نہیں کہ وہ کسی دوسرے انسان سے اپنی اطاعت کرائے۔ یہ محکومی ہو گی جسے مٹانے کے لئے قرآن آیا ہے (۳/۷۸) اس میں اطاعت کسی انسان کی نہیں بلکہ قوانین و احکامِ خداوندی کی ہو گی۔ اور اس اطاعت میں خود وہ بھی شامل ہو گا جو ان احکام و قوانین کی اطاعت کرائے گا۔ یہ قوانین و احکام قرآن کریم کے اندر ہیں اس لئے اطاعتِ خداوندی سے مراد ہو گا قرآن کریم کے قوانین و احکام کی اطاعت کرنا۔ لیکن اسلام انفرادی زندگی کا نام نہیں۔ یہ ایک اجتماعی نظام کا نام ہے اور اجتماعی نظام میں افرادِ معاشرہ کسی مرکزی اتھارٹی کے فیصلوں کے مطابق چلتے ہیں یہ مرکزی اتھارٹی جس نے سب سے پہلے اسلامی نظام قائم کیا تھا خود رسول اللہ ﷺ تھے۔ حضور ﷺ خود بھی احکام و قوانین خداوندی کی اطاعت کرتے تھے۔ اس اطاعت کا نام تھا ''خدا اور رسول ﷺ کی اطاعت'' یعنی احکامِ خداوندی کی اطاعت' اس نظام کی رو سے جسے رسول اللہ ﷺ نے قائم فرمایا تھا رسول اللہ ﷺ مرکزی اتھارٹی تھے اور ان کے نیچے افسرانِ ماتحت (اولوالامر)۔ ان افسرانِ ماتحت کے فیصلوں کے خلاف مرکزی اتھارٹی سے اپیل کی جا سکتی تھی۔ لیکن مرکزی اتھارٹی کا فیصلہ آخری ہوتا تھا۔ یہ نظام رسول ﷺ کی زندگی تک ہی نہیں رہنا تھا۔ اسے آپ ﷺ کے بعد بھی آگے چلنا تھا۔ چنانچہ یہ آگے چلا۔ اس وقت یہ مرکزی اتھارٹی حضور ﷺ کے جانشین (خلفائے راشدینؓ) تھے۔ لہٰذا اس وقت ''خدا اور رسول ﷺ کی اطاعت'' سے مراد ان کے ان فیصلوں کی اطاعت تھی جو وہ قوانینِ خداوندی کی ترویج و تنفیذ کے سلسلہ میں صادر فرماتے تھے۔ اس لئے قرآن کریم نے اطاعت کے لئے اس کی تصریح کر دی ہے کہ وانتم تسمعون (۸/۲۰)۔ درآنحالانکہ تم سن رہے ہو۔ لہٰذا اطاعت ایک زندہ محسوس اتھارٹی کی ہو گی۔ اسلام اس وقت صحیح معنوں میں سامنے آئے گا جب معاشرہ میں وہی نظام قائم ہو۔ یعنی ایسا نظام جس میں قوانین و احکامِ خداوندی کی اطاعت ایک مرکزی اتھارٹی کے تابع کی جائے اور کوئی انسان کسی دوسرے انسان پر اپنی مرضی نہ چلا سکے۔ اسی کا نام توحید ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

﴿ڈاکٹر انعام الحق﴾

حکمت کی باتیں

(انتخاب از خطباتِ اقبال)

(۱) عقل اور ایمان علم ہی کے دو پہلو ہیں۔

(۲) کسی شے کا جاننا اور اس کے معنی و مطلب سمجھنا ایک ہی بات ہے۔

(۳) ہم قرآنِ مجید کا مطالعہ بطور ایک کتاب کے کریں۔ یہ نہیں کہ پہلے سے قائم شدہ افکار اور تصورات کو لے کر اس سے اپنے ارادوں اور مقاصد کی تائید اور جواز کا سہارا ڈھونڈیں۔

(۴) یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ ہم اپنے اعمال و افعال کی بنا کسی ایسے اصول پر رکھیں جو بجائے خود مشتبہ ہو۔

(۵) ٹھیک کہا گیا ہے (میری نظر میں بھی) کہ کانٹ (فلاسفر) ہی کی ذات وہ سب سے بڑا عطیہ ہے جو خدا نے جرمنی کو عنایت کیا۔

(۶) فکر میں حرکت پیدا ہوتی ہے تو محض اس لئے کہ اس کی متنہایت میں لامتناہی بھی مضمر رہتا ہے۔

(۷) جہاں تک علم و حکمت کا تعلق ہے، مغربی تہذیب دراصل اسلامی تہذیب ہی کے بعض پہلوؤں کی ایک ترقی یافتہ شکل ہے۔

(۸) انسان کو تسمیہ اشیا کی قدرت حاصل ہے۔ یعنی وہ ان کے معنی قائم کرسکتا ہے اور معانی کا قائم کرنا گویا ان کو اپنے قابو میں لے آنا ہے۔

(۹) صرف نظریوں کی بنا پر کوئی پائیدار تمدن قائم نہیں رہ سکتا۔

(۱۰) اگر معلول کے لئے علت کا وجود ناگزیر ہے تو علت کے لئے بھی معلول کا، ورنہ علت، علت نہیں رہے گی۔

(۱۱) کسی مقصد کے اشارے؟ آگے بڑھنا گویا اس چیز کی طرف بڑھنا ہے جس کے لئے آگے بڑھنا چاہئے تھا۔

(۱۲) ہماری تکوین کی صورت ہی یہ ہے کہ ہم وہ کچھ نہ رہیں جو ہیں۔

(۱۳) خودی عبارت ہے ''میں ہوں'' سے۔

(۱۴) فطرت کو ذاتِ الٰہیہ سے وہی نسبت ہے جو سیرت اور کردار کو انسانی ذات سے۔

(۱۵) جب ہم زندگی کا مطالعہ عقل کی عینک سے کرتے ہیں' تو اس کی انتہا وحدۃ الوجود پر ہوتی ہے۔

(۱۶) باصطلاح قرآنی عمل تخلیق اور شے مخلوق میں کوئی فرق نہیں۔ ہم جسے شے کہتے ہیں وہ صرف ان اعمال کا مجموعہ ہے جن کا اظہار جواہر کی شکل میں ہو رہا ہے۔

(۱۷) جوہر کی مسلسل ہستی کا دارومدار اعراض کی مسلسل تخلیق پر ہے۔

(۱۸) بحیثیت قدرتِ الٰہیہ کی ایک شان کے جوہر کی ماہیت خالصتاً روحانی ہے۔ گویا نفس محض عمل ہے اور جسم اس عمل کی مرئی ''اس لئے قابلِ پیمائش'' شکل۔

(۱۹) بزمِ ہستی میں ہر کہیں خودی ہی کا نغمہ لحظہ بہ لحظہ تیز ہو رہا اور ذاتِ انسانی میں اپنے کمال کو پہنچ جاتا ہے۔

(۲۰) ذات الٰہیہ کی اولیت زمانے کی اولیت کا نتیجہ نہیں' بلکہ زمانے کی اولیت ذاتِ الٰہیہ کی اولیت کا نتیجہ ہے۔

(۲۱) استدلالی علم ایک زمانی عمل ہے۔ لہٰذا اس کا ایک ماضی ہے' ایک حال اور ایک مستقبل۔

(۲۲) ہمارے پاس اس علم کے لئے کوئی لفظ نہیں جو اپنے معلوم کا آپ ہی خالق ہے۔

(۲۳) یہ صحیح ہے کہ ذات الٰہیہ کی حیات تخلیقی میں جس کی ماہیت ایک وحدتِ نامیہ کی ہے' مستقبل کا وجود پہلے سے قائم ہے' لیکن ایک غیر متعین امکان' نہ کہ حوادث کی ایک ایسی ترتیب کی صورت میں جس کا خاکہ مدت ہوئی تیار ہو چکا تھا۔

(۲۴) ذاتِ الٰہیہ کی اپنی تخلیق آزادی ہے جس کی اس نے تحدید کی تو اس لئے کہ نفسِ متناہیہ بھی اس کی زندگی' طاقت' آزادی اور اختیار میں حصہ لے سکے۔

(۲۵) قرآن مجید میں مقصد عالمگیر اخلاقی سبق' یا کوئی عالمگیر فلسفیانہ حقیقت کا اجاگر کرنا ہوتا ہے۔

(۲۶) آدم کے لفظ کا اشارہ کسی مخصوص انسان کی طرف نہیں۔ اس کی حیثیت ایک تصور (آدمی) کی ہے جس کی تائید قرآنِ پاک سے بھی ہو جاتی ہے۔

(۲۷) جنت کا اشارہ حیاتِ انسانی کے اس ابتدائی دور کی طرف ہے جس میں انسان کا اپنے ماحول سے ابھی عملاً کوئی رشتہ قائم نہیں ہوا تھا' لیکن جو گویا تمہید ہے تہذیب وتمدن کی۔

(۲۸) انسان کی حیثیت خود بھی اپنی جگہ ایک سبب کی ہے۔

(۲۹) انسان کی پہلی نافرمانی وہ پہلا اختیاری عمل تھا جو اس نی اپنی ارادے اور اپنی مرضی سے کیا۔ اس لئے آدم کا یہ گناہ معاف کر دیا گیا۔

(۳۰) آزادی خیر کی شرطِ اولین ہے۔

(۳۱) دراصل ایسی کوئی حقیقت ہی نہیں جس کا وجود سب سے الگ تھلگ ہو' اس لئے کہ ہر حقیقت اپنی جگہ پر ایک ''کل'' ہے۔

(۳۲) غلطی یا خطا بھی' باوجودیکہ ہمیں اس کو ایک ذہنی شر سے تعمیر کرنا پڑے گا' حصولِ تجربات میں ناگزیر ہے۔

(۳۳) بحیثیت ایک ایسے وجودِ زمانی کے جس کو ہر لحظہ موت کا خطرہ ہے' انسان کچھ کر سکتا تھا' تو یہی کہ اپنا سلسلہ نسل جاری رکھے اور یوں بطورِ فرد نہیں تو کم از کم اپنی نسل ہی کے لئے بقائے دوام کی نعمت حاصل کر لے۔

(۳۴) مذہب کے لئے یہ ممکن نہیں کہ صرف تصورات پر قناعت کرے۔

(۳۵) شعورِ نبوت کی صورت میں دعا کی نوعیت سرتا سر تخلیقی ہوتی ہے' یعنی ان سے ایک نیا جہانِ اخلاق وجود میں آتا ہے۔

(۳۶) دراصل علم کی جستجو جس رنگ میں بھی کی جائے' عبادت ہی کی ایک شکل ہے۔

(۳۷) ہمارے لئے بصیرت اور طاقت کا امتزاج ضروری ہے تاکہ عالمِ انسانی روحانی اعتبار سے آگے بڑھ سکے۔

(۳۸) عبادت کی شکل کوئی ایسا مسئلہ نہیں جس سے ہم انسانوں میں بحث ونزاع کا دروازہ کھل جائے۔

(۳۹) اسلام نے عبادت کے لئے ایک مخصوص سمت انتخاب کی تو محض اس لئے کہ جماعت کے اندر ایک ہی قسم کے جذبات موجزن ہوں۔

(۴۰) صلوٰۃ باجماعت سے مقصود ہے کہ سب امتیازات کو مٹاتے ہوئے عملی زندگی میں وحدت کا اظہار حقیقت کے طور کرنے لگیں۔

(۴۱) (شاہ ولی اللہ) ہمارا فرض ہے ماضی سے اپنا رشتہ منقطع کئے بغیر اسلام پر بحیثیت ایک نظام فکر از سرنو غور کریں۔

(۴۲) ہمیں اپنی آزادی رائے برقرار رکھتے ہوئے یہ سمجھنے کی کوشش کرنی چاہئے کہ اسلامی تعلیمات کی تعبیر اب علم حاضر کے پیشِ نظر کس رنگ میں کرنی چاہئیے' خواہ ایسا کرنے میں ہمیں اپنے اسلاف سے اختلافات ہی کیوں نہ ہُوں۔

(۴۳) میرے فیصلے اور میرے عزائم میری اور صرف میری ذات کا حصہ ہیں۔ خدا بھی تو ایسا نہیں کرے گا کہ میری جگہ

خود محسوس کرنا یا حکم لگانا شروع کر دے' یا یہ کہ اگر ایک کی بجائے دو راستے میرے سامنے ہیں تو خود ان سے ایک کا انتخاب کر لے۔

(۴۴) میرا کسی شخص یا کسی مقام کو پہچاننا میری ہی گذشتہ واردات پر مبنی ہوتا ہے جس کا اظہار ہم لفظ ''میں'' سے کرتے ہیں۔

(۴۵) ''خودی'' یا ''انا'' کی حیثیت ایک سادہ' نا قابلِ تجزیہ اور نا قابلِ تحول (غیر متبدل) جوہرِ روحانی کی ہے' جسے کیفیاتِ نفسی کے سارے مجموعے سے کلیتاً مختلف' علی ہذا مرورِ زمانہ کے اثرات سے سرتا سر آزاد تصور کیا جاتا ہے۔

(۴۶) کانٹ کہتا ہے یہ ''میرا خیال'' جو ہمارے ہر خیال کا (اظہارِ خیال کے لئے) مستلزم ہے' محض ایک ضابطے کی بات ہے اور اسے حقیقت ٹھہرانا منطقی اعتبار سے حجت نہیں رکھتا۔

(۴۷) خودی ایک گذرتے ہوئے ارتعاش کا ابھرتے ہوئے ارتعاش اور اس ابھرتے ہوئے ارتعاش کا بعد میں ابھرنے والے ارتعاش سے کام لینے کا عمل ہے۔

(۴۸) جب ہم کسی شے کا ادراک کرتے' یا اس پر حکم لگاتے' یا کوئی ارادہ کرتے ہیں تو ایسا کرنے میں خودی ہی سے آشنا ہوتے ہیں۔

(۴۹) میں شے نہیں عمل ہوں۔

(۵۰) اہم بات یہ نہیں کہ کسی چیز کی ابتدا کیوں کر ہوئی' بلکہ یہ کہ اس کی انتہا کیا یعنی رسائی کہاں تک ہے۔

(۵۱) شروع شروع میں تو اگرچہ طبع کا نفس پر غلبہ ہوتا ہے' لیکن پھر جیسے جیسے نفس طاقت حاصل کرتا ہے طبع پر چھا جاتا ہے اور اس لئے عین ممکن ہے آخر الامر اس سے بالکل آزاد ہو جائے۔

(۵۲) تقدیر پرستی (قسمت) نتیجہ تھی بعض فلسفیانہ افکار اور کچھ سیاسی مصلحت پسندیوں کا۔

(۵۳) خودی کی نشوونما کا معراجِ کمال یہ ہے کہ ہم خودی سے براہِ راست اتصال میں بھی جو سب پر محیط ہے' اپنے آپ کو قائم اور برقرار رکھ سکیں۔

(۵۴) جس ہستی کی ارتقاء میں لاکھوں کروڑوں برس صرف ہوئے اس کے متعلق یہ کہنا کچھ غیر اغلب سا نظر آتا ہے کہ وہ ایک عبث اور لاحاصل شے کی طرح ضائع ہو جائے گی۔

(۵۵) ہستی ایک روز افزوں خودی کی حیثیت سے ہی کائنات کے مقصود و مدعا میں شریک ہوگی۔

(۵۶) قرآن پاک کی رو سے یہ عین ممکن ہے کہ ہم انسان کائنات کے مقصود و مدعا میں حصہ لیتے ہوئے غیر فانی ہو جائیں۔

(۵۷) اعمال کا نتیجہ نہ تو لطف ہے نہ درد۔ اعمال یا تو خودی کو سہارا دیتے ہیں یا اس کی ہلاکت اور تباہی کا سامان پیدا کرتے ہیں۔

(۵۸) بقائے دوام انسان کا حق نہیں۔ اس کے حصول کا دارومدار ہماری مسلسل جدوجہد پر ہے۔ بالفاظِ دیگر ہم اس کے امیدوار ہیں۔

(۵۹) خودی نے اپنے عمل اور سعی کی بدولت اگر اسی زندگی میں اتنا استحکام پیدا کرلیا ہے کہ موت کے صدمہ سے محفوظ رہے تو اس صورت میں موت کو بھی ایک راستہ ہی تصور کیا جائے گا۔

(۶۰) بعث بعدالموت کوئی خارجی حادثہ نہیں۔ یہ خودی کے اندر ایک حیاتی عمل کی تکمیل ہے۔

(۶۱) قرآن مجید کی روشنی کے مطابق' رومی بقائے دوام کے مسئلے کو ارتقائے حیات ہی کا ایک مسئلہ ٹھہراتا ہے۔

(۶۲) حکمائے عصرِ حاضر نے بغیر کسی دلیل کے یہ فرض کرلیا ہے کہ ہم انسان اپنے ارتقاء کی جس منزل میں ہیں' ہمارے ارتقاء کی آخری منزل ہے۔

(۶۳) قرآن مجید نے جن مماثلتوں کی طرف اشارہ کیا ہے ان سے مقصود صرف یہی ظاہر کرنا ہے کہ بعثِ ثانیہ ایک حقیقت ہے یہ نہیں کہ اس کی ماہیت کیا ہے۔

(۶۴) جنت اور دوزخ اس کے احوال ہیں مقامات یعنی کسی جگہ کا نام نہیں۔

(۶۵) دوزخ انسان کے اندر بہ حیثیت انسان اپنی ناکامی کا دردانگیز احساس ہے۔

(۶۶) بہشت کا مطلب ہے فنا اور ہلاکت کی قوتوں پر غلبے اور کامرانی کی مسرت۔

(۶۷) انسانی سیرت کا تقاضا ہے کہ جوں جوں زمانہ گذرے' اس میں سختی اور پختگی پیدا ہوتی جائے۔

(۶۸) عذاب درحقیقت تادیب کا ایک عمل ہے تاکہ جو خودی پتھر کی طرح سخت ہوگئی ہے وہ پھر رحمت خداوندی کی نسیم جاں فزا کا اثر قبول کرسکے۔

(۶۹) خودی کی زندگی اختیار کی زندگی ہے' جس کا ہر عمل ایک نیا موقعہ پیدا کرتا ہے۔

(۷۰) جوکوئی اندھوں کی طرح آیاتِ فطرت سے اپنی آنکھیں بند رکھتا ہے' وہ آگے چل کر بھی اندھا ہی رہے گا۔

(۷۱) دنیائے قدیم کو عہد قبل سائنس کی دنیا تصور کرنا چاہئے۔

(۷۲) اجتہاد' اسلام کی ہیئتِ ترکیبی کے اندر حرکت اور تغیر قائم رکھتا ہے۔

(۷۳) نظری طور پر اہل سنت والجماعت نے اجتہاد کی ضرورت سے کبھی انکار نہیں کیا' لیکن محال شرطیں لگا کر اسے ناممکن بنا دیا ہے۔

(۷۴) ماضی کا غلط احترام' اسلام کی اندرونی روح کے منافی تھا۔

(۷۵) تہذیب جدید کو' جس کی بنا وطنی انانیت پر ہے' انسان کے دورِ وحشت اور بربریت ہی کی ایک شکل تصور کرنا چاہئے۔

(۷۶) تاریخ کا فیصلہ ہے کہ جن فرسودہ خیالات کو خود کسی قوم نے فرسودہ کر دیا ہو' ان کی تجدید پھر اس قوم میں نہیں ہو سکتی۔

(۷۷) ہمارا ذہن ایک ایسے بین الاقوامی نصب العین کی طرف حرکت کر رہا ہے جو گویا اسلام کا منتہائے نظر ہے۔

(۷۸) بین الاقوامی دنیا میں کمزوروں سے کوئی ہمدردی نہیں کرتا۔ یہاں صرف طاقت کا احترام کیا جاتا ہے۔

(۷۹) اسلام نہ تو وطنیت ہے' نہ شہنشاہیت بلکہ ایک انجمن اقوام جس نے ہمارے خود پیدا کردہ حدود اور نسلی امتیازات کو تسلیم کیا ہے تو محض سہولتِ تعارف کے لئے۔ اس لئے نہیں کہ اس کے ارکان اپنا اجتماعی مطمحِ نظر محدود کر لیں۔

(۸۰) (ہابس) ایک ہی قسم کے خیالات اور احساسات کے تسلسل کا مطلب بجز اس کے اور کیا ہو سکتا ہے کہ ہمارے کوئی خیالات اور احساسات ہی نہیں۔

(۸۱) **حسبنا کتاب اللہ** (ہمارے لئے اللہ کی کتاب ہی کافی ہے۔) کی وہی روح جس کا اظہار حضرت عمرؓ کی ذات میں ہوا تھا' وہی اخلاقی جرات اپنانے کا وقت ہے۔

(۸۲) مسلمانوں کی ہر نسل کے لئے ضروری ہے کہ وہ اسلاف کی راہنمائی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے مسائل آپ حل کرے۔ یہ نہیں کہ اسلاف کو اپنے لئے ایک رکاوٹ تصور کرے۔

(۸۳) مسلمانوں کے یہاں جو مجموعہ ہائے احادیث معتبر ٹھہرائے جاتے ہیں' ان کا زائد حصہ فی الواقعہ اسلام کے ظہور اور ابتدائی نشوونما کی حقیقی تاریخ ہے۔

(۸۴) ہمیں تو شاید یہ بھی معلوم نہیں کہ نبوی دور کے جس رسم و رواج کو جوں کا توں چھوڑ دیا گیا' اس پر کیا سچ مچ ہر کہیں اور ہر زمانے میں عمل کرنا مقصود تھا۔

(۸۵) (شاہ ولی اللہ) چونکہ فقہی احکام مقصود بالذات نہیں' اس لئے یہ بھی ضروری نہیں کہ ان کو آئندہ نسلوں کے لئے بھی واجب ٹھہرایا جائے۔

(۸۶) فقہائے متاخرین کو ذخیرہ علم کی دستیابی کی صورت میں اجتہاد کے لئے زیادہ آسانیاں ہیں۔

(۸۷) تجربہ کہتا ہے کہ جس حق وصداقت کا انکشاف عقلِ محض کی وساطت سے ہوا' اس سے ایمان ویقین میں وہ حرارت پیدا نہیں ہوتی جو وحی وتنزیل کی بدولت ہوتی ہے۔

(۸۸) سائنس کے جدید اکتشافات کو دیکھئے تو عقلاً بھی الٰہیات کے ایک مرتب نظام کی تشکیل کچھ زیادہ دشوار نظر نہیں آتی۔

(۸۹) یہ صرف معانی ہیں جن میں ہم دوسروں کو شریک کر سکتے ہیں۔

(۹۰) یہ سیرت وکردار ہی تو ہے جس سے انجام کار صاحبِ کردار کی قسمت کا فیصلہ ہوگا۔

(۹۱) خودی کا نصب العین یہ نہیں کہ کچھ دیکھے بلکہ یہ کہ کچھ بن جائے۔

(۹۲) انسان کی حقیقت کا انکشاف ''میں سوچتا ہوں'' سے نہیں بلکہ ''کرسکتا ہوں'' سے ہوگا۔

(۹۳) دنیا محض دیکھنے یا افکار وتصورات کی شکل میں سمجھنے کی چیز نہیں' بلکہ ایسی چیز ہے جس کو ہم مسلسل عمل سے بار بار بناتے اور بنا کر پھر بناتے رہتے ہیں۔

(۹۴) اگر عقلِ نظری ہی وہ استعداد ہے جو حقیقت کا ادراک کرسکتی ہے تو یہ ادراک صرف معقول تک محدود رہے گا۔

(۹۵) صلوٰۃ بھی دعا ہی کی ایک شکل ہے۔

(۹۶) مذہب میں خودی کا تعلق کسی ایسی حقیقت سے قائم نہیں ہوتا' جو ہماری ذات سے باہر اور خارج میں واقع ہو۔

(۹۷) جب تک انسان کو اپنے آغاز اور انتہا کی کوئی نئی جھلک نظر نہیں آتی' وہ کبھی اس معاشرے پر غالب نہیں آسکتا۔

(۹۸) روحانی زوال کی حالت میں لوگ اپنے اکابر مفکرین کو بتوں کی طرح پوجنا شروع کر دیتے ہیں۔

(۹۹) عہدِ حاضر کے مسلمان کبھی یہ گوارا نہیں کریں گے کہ اپنی آزادیِ ذہن کو خود اپنے ہاتھوں قربان کر دیں۔

(۱۰۰) قرآن مجید کا مطمحِ نظر جمود کی بجائے حرکت پر رہا۔ لہٰذا اس کی روش ارتقاء کے خلاف کیسے ہوسکتی ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

خواجہ ازہر عباس، فاضل درسِ نظامی

ہر قرآنی قانون کی اطاعت عبادت ہے
اور ہر عبادت قانون کا درجہ رکھتی ہے

لندن سے محترم جناب اکرم قریشی صاحب نے چند سوالات کئے تھے۔ اس کے بعد ان کا دوبارہ تقاضا موصول ہوا۔ چونکہ یہ سوالات اہمیت کے حامل ہیں اور اکثر حضرات کو اس قسم کے شبہات کا سامنا ہوتا رہتا ہے۔ اس لئے ان کے جوابات طلوع اسلام میں طبع کئے جاتے ہیں کیونکہ یہ رسالہ قرآن کریم کی خالص فکر کی اشاعت اپنا فریضہ سمجھتا ہے۔ قریشی صاحب نے فرمایا۔

(۱) رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ قرآنِ کریم وحی الٰہی ہے اور ہمیں بھی قول رسول یعنی احادیث سے ہی یہ معلوم ہوتا ہے کہ قرآن وحی ہے۔ جو حضرات حدیث کو نہیں مانتے وہ قرآن پر کس طرح ایمان لاتے ہیں۔ کیونکہ قرآن کا وحی ہونا تو احادیث سے ہی معلوم ہوتا ہے۔

(۲) اگر کوئی شخص حدیث نہیں مانتا، تو وہ نماز کس طرح پڑھ سکتا ہے۔

(۳) حدیث سے انکار کرنے کے بعد، اطاعت رسول کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ پھر اطاعت رسول کی عملی شکل کیا ہو سکتی ہے۔

محترم المقام جناب قریشی صاحب کے تین سوالات/اعتراضات جناب نے ملاحظہ فرمائے، ان کے جوابات پیش خدمتِ عالی ہیں۔

جہاں تک حدیث کے انکار اور اقرار کا تعلق ہے اس کے متعلق تو ادارہ طلوع اسلام کا جو موقف ہے وہ مضمون کے آخر میں عرض کیا جائے گا۔ شروع میں جناب محترم مستفسر کے سوالات کے جواب ملاحظہ فرمائیں۔

صدرِ اول میں، حضور علیہ السلام اور آپ کے صحابہ کرامؓ کی سرتوڑ کوششوں کی وجہ سے مکہ و مدینہ کے لوگ مسلمان ہوئے۔ یہ لوگ حضور ﷺ کی سیرت اور اسلام کی تعلیم سے متاثر ہو کر مسلمان ہوئے۔ اس کے فوری بعد خلافت راشدہ کا دور شروع ہوا جس میں نہایت تیزی کے ساتھ فتوحات ہوئیں اور مفتوح ممالک کے عوام مسلمان

ہوتے چلے گئے۔ احادیث کے ڈھیر تیسری صدی ہجری کے بعد جمع ہونے شروع ہوئے جبکہ مسلمان مراکو اور سپین سے لے کر سندھ تک پہنچ چکے تھے۔ اسلام کی تبلیغ و اشاعت اور مسلمانوں کے حلقے کا وسیع سے وسیع تر ہونے میں اس وقت تک احادیث کا کوئی دخل نہیں تھا۔ کیونکہ اس وقت تک ان کے ذخیرے جمع ہی نہیں ہوئے تھے۔ اس کے بعد مسلمانوں کی نسلیں جو آتی چلی گئیں وہ نسل در نسل ''پیدائشی مسلمان'' ہوتی چلی گئیں۔ آپ اس بات کو عملاً اپنے دور میں ملاحظہ فرمائیں' آج ساری دنیا میں ایک ارب سے زیادہ مسلمان ہیں' ہم میں سے کتنے مسلمان ہیں جو احادیث کے ذریعے اسلام سے متعارف ہوئے۔ شروع میں لوگ حضورﷺ اور صحابہ کرامؓ کی محنتوں کی وجہ سے مسلمان ہوئے اور اس کے بعد فتوحات اور نسلی طور پر ''پیدائشی مسلمان'' ہوتے چلے گئے۔ آپ حضرات میں سے کتنے ہیں جنہوں نے بخاری شریف یا صحیح مسلم شریف کے مطالعہ سے متاثر ہوکر' قرآن پر ایمان لائے۔ بلکہ حقیقت تو اس کے بالکل برعکس ہے کہ حدیث کی پوزیشن تو اس معاملہ میں بڑی کمزور ہے۔ آپ اگر احادیث کے ذخیرے پر اس نکتہ نگاہ سے غور فرمائیں' تو ان کتب میں قرآن کریم کی جمع و تدوین کے بارے میں ایسی ایسی روایات موجود ہیں جن کے مطالعہ کے بعد' مسلمان ہونا تو کجا' اچھا خاصا مسلمان بھی قرآن و اسلام سے برگشتہ ہو جائے۔ اس قسم کا مواد ادارہ طلوع اسلام کے لٹریچر میں بڑی تعداد میں فراہم کیا گیا ہے۔ اس کو دوبارہ تحریر کرنے سے وقت ضائع کرنا ہے۔ ان روایات کے مطابق قرآن کریم حضورﷺ کے عہد کے بہت عرصہ بعد مرتب ہوا۔ اس میں چند آیات جمع ہونے سے بھی رہ گئیں' کچھ غلط تحریر کر دی گئیں' اور اسی قسم کی دیگر ہفوات جمع کی گئی ہیں کہ ان کو ایک مضمون میں درج نہیں کیا جا سکتا' اور اس کے لئے کئی مضمون درکار ہیں۔

جہاں تک نماز کا تعلق ہے۔ اس سلسلہ میں پہلے ایک مختصر سی تمہید پیش خدمت عالی ہے۔ اس کو بالکل Un-Biased ہوکر ذرا بغور مطالعہ فرمائیں کہ یہ بات بڑی اہم ہے۔

قرآن کریم کے ہر قانون کی اطاعت عبادت ہے اور ہر عبادت زندگی کے لئے خود ایک قانون کا درجہ رکھتی ہے۔ اس کے قوانین کے مطابق جس قدر بھی اعمال کئے جائیں وہ سب عبادات ہیں۔ چونکہ قرآنِ کریم انفرادی تصور حیات کے خلاف صدائے احتجاج ہے اور اجتماعی تصور حیات کا داعی ہے۔ اس لئے قرآن کریم یا اسلام کے قوانین کی اطاعت صرف معاشرہ کے اندر کی جا سکتی ہے۔ تنہا' انفرادی طور پر' خانقاہوں' اور تجردگاہوں میں قرآن کے قوانین پر عمل پیرا نہیں ہوا جا سکتا۔ انسانی ذات کی تربیت یا اس کی نشوونما صرف معاشرہ کے اندر ہوسکتی ہے۔ الگ انفرادی طور پر نہیں ہوسکتی۔ قرآن کریم کے

اتباع سے اس کی تربیت ہوتی ہے۔ قرآن کریم نے حکم فرمایا کہ تم جب دوسروں کے گھروں میں داخل ہو تو داخل ہونے سے پیشتر گھر والوں سے اجازت حاصل کرلو۔ قرآن کریم نے غیبت کرنے سے منع فرمایا ہے کہ غیبت کرنا ایسا ہے جیسے اپنے مردار بھائی کے گوشت کو کھانا ہے۔

قرآن کریم نے حکم دیا کہ جب قرض کا لین دین کرو تو اس کو ضبط تحریر میں لے آیا کرو۔ قرآن نے حکم دیا کہ ایک دوسرے کا مذاق نہ اڑایا کرو۔ قرآن نے حکم دیا کہ سخت تنگی کے باوجود ایک دوسرے پر ایثار کیا کرو۔ یہ ٹھیٹ دنیاوی معاملات ہیں' لیکن ان احکامات کی اطاعت' عبادت خداوندی ہے اور یہ عبادت صرف معاشرہ میں ہو سکتی ہے۔ اسی طرح قرآن نے زکوٰۃ وانفاق کا حکم دیا کہ اس سے تربیت ذات ہوتی ہے۔ قرآن نے فرمایا کہ جو اپنا مال دوسرے پر خرچ کرتا ہے اس کا تزکیہ نفس ہوتا ہے۔ اس قسم کے تمام احکامات پر عمل کرنا ایک معاشرہ کا متقاضی ہے۔ جو آدمی جنگل میں رہتا ہے یا جو شخص رہبانیت اختیار کر لیتا ہے' اسے نہ تو ان احکامات کی ضرورت ہے اور نہ وہ ان پر عمل کرسکتا ہے۔ بلکہ درست بات تو یہ ہے کہ وہ انسانیت کے Level پر زندگی ہی بسر نہیں کر رہا ہے۔ تزکیہ نفس صرف اسلامی حکومت کی اطاعت وفرمانبرداری کرنے سے حاصل ہوتا ہے۔ اور اسی سے تقویٰ میں اضافہ ہوتا ہے اور یہ عقیدہ انفرادی عبادت کی جڑ کاٹ کے رکھ دیتا ہے اور جب تک مسلمانوں میں انفرادی عبادت کا تصور باقی رہے گا وہ کبھی اللہ ورسول کی اطاعت نہیں کرسکیں گے۔ اللہ ورسول کی اطاعت صرف اجتماعی طور پر ہوتی ہے انفرادی طور پر الگ الگ نہیں ہوسکتی اور یہی خالص دین الٰہی ہے۔

لیکن دین کے اس تصور کے بالکل برخلاف مذہب کا تصور ہے۔ جس کی کوئی واضح تعریف (Definition) نہیں کی جاسکتی۔ یہ محض ذہنی نظریہ کا نام ہے۔ یہ ایک بالکل Subjective داخلی اور پرائیویٹ معاملہ ہوتا ہے' اس میں چند رسوم ادا کرنی ہوتی ہیں جو ہر شخص کسی جگہ بھی ادا کرسکتا ہے۔ مذہب کو دنیا کے کسی ضابطۂ حیات سے کوئی تعلق نہیں ہوتا' کسی ملک میں کوئی بھی ضابطۂ حیات ہو' مذہب کی رسوم ہر جگہ ادا کی جاسکتی ہیں۔ اس میں خدا اور انسان کا ذاتی معاملہ ہوتا ہے' اور اسی وجہ سے اس میں انفرادی عبادت کی جاتی ہے۔

دین اور مذہب کے یہ دو الگ الگ تصورات ہیں جو ایک دوسرے کے خلاف ہیں۔ اجتماعی صلوٰۃ کی بنیاد اس تصور پر ہے کہ انسانی ذات کی تربیت صرف معاشرہ میں ہوسکتی ہے۔ جس کی مثالیں جناب نے ملاحظہ فرمائی ہوں گی اور عبادت کا مطلب قوانین خداوندی کی اطاعت ہے جو انفرادی طور پر ممکن نہیں۔ اس کے برعکس انفرادی (مذہبی) صلوٰۃ کی بنیاد اس تصور پر ہے کہ تزکیہ نفس معاشرہ کے بغیر بھی ہوسکتا ہے اس کے لئے اوراد و وظائف' تسبیح وتہلیل'

مجاہدہ وغیرہ کرنا ہوتا ہے اور اس سے مقصود اللہ کی پرستش Worship ہے۔ اس تصور کی بنیاد خالص رہبانیت پر استوار ہوتی ہے۔ جو قرآنِ کریم کے تصورِ عبادت کے بالکل خلاف ہے۔ اس مختصر سی تمہید کے بعد آپ خود اندازہ فرمائیں کہ دین میں انفرادی صلوٰۃ (نماز) کا کیا مقام ہو سکتا ہے۔ (نماز کے متعلق ادارہ طلوعِ اسلام کی رائے اور دیگر تفصیل کے لئے ملاحظہ کیجئے مضمون بعنوان ''نماز کی اہمیت'' جو اسی شمارے میں شائع کیا جا رہا ہے۔)

تاہم' اگر اس تمہید کو آپ نظر انداز فرما دیں' تو برسبیلِ تنزل عرض ہے کہ جہاں تک نماز پڑھنے کا تعلق ہے کہ احادیث ماننے کے بغیر کس طرح نماز ادا کی جائے تو یہ بھی ایک Eye-Wash ہی ہے۔ کیونکہ احادیث کو ماننے کے باوجود بھی آج تک یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ نماز کا صحیح طریقہ کیا ہے اور حضورﷺ کس طرح نماز پڑھتے تھے۔ آج بھی سب فرقوں کی نمازیں مختلف ہیں۔ احادیث کے ذریعے ان کا تعین ہی نہیں ہو سکتا۔ قرآن کریم نے اقامتِ صلوٰۃ کے لئے غلبہ و اقتدار شرط قرار دیا ہے (۴۱/۲۲)۔ نیز اس کے علاوہ مختلف مقامات پر خود صلوٰۃ کے ارکان کی وضاحت کر دی ہے کہ اس کے بعد احادیث کی طرف توجہ کرنے کی ضرورت نہیں رہتی۔ قرآن کریم نے فرمایا: وَارْكَعُوا مَعَ الرَّاكِعِينَ (۲/۴۳)۔ رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کرو وَاسْجُدْ وَاقْتَرِب (۹۶/۱۹)۔ سجدہ کرو اور قرب خداوندی حاصل کرو۔ وَالَّذِينَ يَبِيتُونَ لِرَبِّهِمْ سُجَّداً وَقِيَاماً (۲۵/۶۴)۔ یہ لوگ وہ ہیں کہ اپنے رب کے لئے راتوں میں سجدہ و قیام کرتے ہیں۔ ان مقامات نے نماز کے ارکان کی خود وضاحت کر دی ہے۔

قرآن کریم میں ارشاد ہوتا ہے۔ اعْدِلُوا هُوَ أَقْرَبُ لِلتَّقْوَى (۵/۸)۔ عدل کرو کہ یہ تقویٰ کے قریب ہے۔ اسی طرح بیشتر مقامات پر حکم ہے اقیموا الصلوٰۃ' عدل فراہم کرنے میں حضور کے عہد سے لے کر آج تک بے شمار تبدیلیاں ہوتی رہیں۔ حضورﷺ کا دور سادہ تھا اس لئے عدل کرنے کے طریقے بھی سادہ تھے کہ جن سے عدل حاصل کرنا بھی یقینی نہیں تھا۔ اس دور میں عدل کرنے کے طریقے بدل گئے' اور سائنٹفک طریقوں سے عدل حاصل کرنے میں زیادہ امکان ہے کہ جج صحیح صورت حال پر پہنچ جائے۔ اسی طرح صلوٰۃ کا طریقہ ہے کہ اس میں بھی اپنے اپنے دور کے مطابق تبدیلیاں کرنی ضروری ہیں۔ قرآن کریم نے انسانیت سے متعلق تمام ضروری چیزوں کی ہدایت خود مہیا کی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے کہ: جب کوئی افواہ سنو تو اس کی تصدیق کر لیا کرو۔ دوسروں کے گھروں میں بغیر اجازت داخل نہ ہو (۲۴/۲۷)۔ عائلی زندگی کی چھوٹی چھوٹی باتیں بھی بیان کیں' یہاں تک کہ معمولی معمولی معاشرتی ہدایات بھی دی ہیں اگر نماز کی جزئیات کوئی اہمیت رکھتی ہوتیں تو قرآن کریم ان کو خود بیان کر دیتا۔ جب

قرآن نے خود کوئی اہمیت نہیں دی تو اب ان کو احادیث کی کتابوں میں تلاش کرنا ہی مناسب نہیں ہے۔

اس وقت نماز ایک قومی و ملی شعائر کی حیثیت رکھتی ہے' البتہ جب یہ دین کے نظام میں بطور صلوٰۃ ادا کی جانے لگے' تو یہ ارکان دین میں شمار ہوگی۔ قومی و ملی شعائر اور ارکان دین میں واضح امتیاز یہ ہے کہ ارکان دین وہ نتائج ضرور برآمد کرتے ہیں جن کا وعدہ قرآن نے کیا ہوتا ہے۔ اور اگر وہ ارکان قرآن کریم کے موعودہ نتائج برآمد نہ کریں تو وہ ارکان دین نہیں رہتے وہ قومی و ملی شعائر ہو جاتے ہیں جیسا کہ اب ہمارے ہاں نماز کی کیفیت ہے۔

جہاں تک قریشی صاحب کے تیسرے سوال کا تعلق ہے' تو اس کا جواب کئی مرتبہ دیا جا چکا ہے۔ تاہم ان کے حکم کی تعمیل میں عرض ہے کہ:

یہ بات واضح رہے کہ حضورﷺ کی اپنے عہد مبارک میں تین مختلف حیثیتیں (Positions) تھیں۔

(۱) حضورﷺ اللہ کے رسول تھے اور یہ حضورﷺ کی منفرد حیثیت تھی' اس حیثیت میں حضورﷺ کے ساتھ اور کوئی شریک نہیں تھا۔ وحی کے جو احکامات حضورﷺ پہنچاتے تھے' ان احکامات کی سرانجام دہی میں حضورﷺ کی اطاعت کرنا ضروری تھا۔

(۲) دوسری حیثیت حضورﷺ کی ذاتی تھی۔ حضورﷺ جو ذاتی تجویز یا خواہش کسی کو پیش فرماتے' ان پر عمل درآمد کرنا ضروری نہیں تھا' اس لئے کہ حضورﷺ کی ذاتی اطاعت فرض نہیں تھی۔ اگر حضورﷺ کسی روز چاول تناول فرماتے' اور دوسرے صحابہؓ کو ارشاد فرماتے کہ وہ بھی چاول ہی کھائیں تو یہ حضورﷺ کی ذاتی اطاعت ضروری نہیں تھی۔ اسی طرح اگر حضورﷺ اپنے کسی صحابیؓ کو فرماتے کہ وہ اپنے بیٹے کو کسی مقام پر ملازم کرا دیں' تو ضروری نہیں تھا کہ وہ صحابیؓ اپنے بیٹے کو اسی جگہ ملازم کرا دیں۔ یہ بات کہ حضورﷺ کی ذاتی' بشری اطاعت فرض نہیں تھی' اس کے دلائل اس سے پیشتر بھی کئی مرتبہ دیے جا چکے ہیں ان کا بار بار دہرانا' قارئین کرام کا وقت ضائع کرنا ہے۔ تاہم مختصراً حوالے پیش خدمت عالی کئے جاتے ہیں۔

(۱) اس بارے میں حضرت زبیرؓ کا واقعہ خاص اہمیت کا حامل ہے کہ حضرت زبیر نے حضورﷺ کے اصرار کے باوجود حضرت زینبؓ کو طلاق دی' لیکن پھر بھی قرآن نے ان کے نام کے ساتھ أَنْعَمَ اللَّهُ عَلَيْهِ وَأَنْعَمْتَ عَلَيْهِ (۳۳/۳۷)۔ کے الفاظ استعمال کئے ہیں۔

(۲) حضرت اویسؓ بن صامت اور حضرت خولہؓ کا واقعہ جس کا ذکر سورۃ مجادلہ کی پہلی آیۂ کریمہ میں کیا گیا ہے۔

(۳) مومنین کے علاوہ حضورﷺ کو خود بھی شوریٰ کا حکم دیا گیا تھا' جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضورﷺ کی ذاتی اطاعت ضروری نہیں تھی۔ کیونکہ ذاتی اطاعت میں مشورہ کو

دخل نہیں ہوسکتا۔

(۴) سورہ (۱۲/۶۰) میں ارشاد ہوتا ہے کہ حضورﷺ کی اطاعت صرف معروف میں' یعنی اسلامی حکومت کے احکامات کی سرانجام دہی میں ضروری و لازمی تھی۔ وَلَا یَعْصِیْنَكَ فِیْ مَعْرُوْفٍ (۱۲/۶۰)۔معروف کے علاوہ' حضورﷺ کی ذاتی اطاعت ضروری نہیں تھی۔

تیسری حیثیت حضورﷺ کی ایک سربراہِ مملکت کی تھی اس میں بھی پہلی صورت کی طرح حضورﷺ کی اطاعت لازمی تھی۔ قرآنِ کریم میں جہاں جہاں حضورﷺ کی اطاعت فرض کی گئی ہے۔ (۶۵/۴' ۶۱/۴' ۵۱/۲۴)۔ وہاں حضورﷺ کی یہی حیثیت پیش نگاہ ہوتی تھی۔ اس حیثیت میں بھی حضورﷺ کی ذاتی اطاعت فرض نہیں تھی' حضورﷺ کے اپنے عہد مبارک میں بھی قرآنی احکامات کی اطاعت کے سلسلہ میں' اگر مقدمات صرف اولی الامر تک ہی جاتے تھے' اور اولی الامر اپنے طور پر فیصلہ کر دیتے تھے تو ان اولی الامر کی اطاعت ہی حضورﷺ کی اطاعت ہو جاتی تھی۔ حضورﷺ کی یہ اطاعت ایک سربراہِ مملکت کی حیثیت سے ہوتی تھی۔ اور حضورﷺ کے انتقال کے بعد' یہی اطاعت آپ کے خلفاء کی طرف منتقل ہوگئی۔ حضورﷺ کے بعد حضرت ابوبکرؓ کی اطاعت' ان کے بعد حضرت عمرؓ کی اطاعت' خود حضورﷺ کی اطاعت تھی۔ اور اب بھی حضورﷺ کی اطاعت کرنے کی عملی شکل یہی ہے کہ خلافت راشدہ کا احیاء کیا جائے اور اس کے سربراہ کی اطاعت کی جائے۔ کیونکہ خلیفہ راشد کی اطاعت ہی اللہ و رسول کی اطاعت یا عبادت خداوندی ہوگی۔ سربراہِ مملکت اسلامیہ کی اطاعت ہی عبادت خداوندی ہے جو صرف اجتماعی طور پر ادا کی جاسکتی ہے۔

جہاں تک حدیث کے ماننے اور نہ ماننے کا سوال ہے تو اس دور میں جب تک دین کا عملاً کوئی قیام نہ ہو' ہر وہ حدیث جو قرآن کریم کے مطابق ہے' وہ درست ہے لیکن جو حدیث قرآن کے خلاف ہے' طلوع اسلام اس کو حدیث رسول ماننے کو تیار نہیں۔ کیونکہ اس کے نزدیک حق و باطل کا معیار صرف قرآن کریم ہے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نماز کی اہمیت

طلوع اسلام کے خلاف مسلسل ہونے والے منفی پروپیگنڈا کے زیر اثر ہمارے نئے قارئین کی طرف سے اکثر یہ سوال پوچھا جاتا ہے کہ طلوع اسلام یا پرویز صاحب کا نماز سے متعلق نظریہ کیا تھا؟ سو ان احباب کے استفادہ کے لئے نماز سے متعلق پرویز علیہ الرحمتہ کی وہ تحریریں جو طلوع اسلام کے مختلف پرانے شماروں اور کتابوں میں شامل ہیں، ان کو یکجا کر کے شائع کیا جا رہا ہے۔ امید ہے آپ اس کاوش کو مفید پائیں گے۔

ایک صاحب نے مجھ سے حسب ذیل سوالات دریافت کئے ہیں۔

(۱) آپ کہتے ہیں کہ اسلام قوانین خداوندی کا نام ہے۔ اس میں نماز کی اہمیت اور مقام کیا ہے؟

(۲) نماز اور صلوٰۃ میں کیا فرق ہے۔ آپ نے کہیں اس کی صراحت کی ہے کہ صلوٰۃ سے مراد نماز ہے؟

(۳) کیا آپ نماز کی موجودہ شکل کے علاوہ کوئی اور شکل تجویز کرتے ہیں؟

جواب

(۱) اسلام نام ہے زندگی کے ہر شعبے میں احکام خداوندی کے سامنے سرِتسلیم خم کر دینے کا۔ ان کی پوری پوری اطاعت کرنے کا۔ نماز، اس طرح سرِتسلیم خم کرنے کا عملی اعتراف اور محسوس مظاہرہ ہے۔ خدا کے سامنے سر جھکا دینے (سجدہ ریز ہو جانے) سے انسان اس امر کا اقرار (یا اظہار) کرتا ہے کہ وہ اپنے ہر ارادے، فیصلے اور عمل میں اس کے احکام کی اطاعت کرے گا۔ جس کا دل، جذبات فرماں پذیری اور اطاعت گزاری سے لبریز ہو، اس کا سر خود بخود خدا کے حضور جھک جائے گا اور جو خدا کے حضور سر جھکانے میں عار یا سبکی محسوس کرتا ہے وہ اس کی اطاعت کیا کرے گا؟ لیکن اس کے ساتھ یہ بھی واضح ہے کہ جو شخص زندگی کے مختلف شعبوں میں قوانین خداوندی سے سرکشی برتتا ہے، اس کا نماز میں رسمی طور پر سر جھکا دینا، مقصد صلوٰۃ کو پورا نہیں کر سکتا۔

(۲) نماز فارسی (بلکہ پہلوی) زبان کا لفظ ہے جو اہل ایران کے قدیم طریق پرستش کے لئے استعمال ہوتا تھا۔ بعد میں یہ لفظ، اجتماعات صلوٰۃ کے لئے استعمال کر لیا گیا اور اب ہمارے ہاں یہی لفظ مروج ہے (میں سمجھتا ہوں کہ جو

اصطلاحات قرآن کریم نے مقرر کی ہیں انہیں اسی طرح استعمال کرنا زیادہ اچھا ہے) قرآن کریم میں صلوٰۃ کا لفظ آیا ہے جو معنوی اعتبار سے بڑا وسیع اور جامع ہے۔ اس کے بنیادی معنی کسی کا اتباع یا اطاعت ومحکومیت اختیار کرنا ہیں۔ قرآن کریم نے اس لفظ کو نماز کے اجتماعات کے لئے بھی استعمال کیا ہے۔ لہٰذا جب ہم نماز کا لفظ بولیں گے تو اس کا مطلب صرف نماز ہوگا۔ لیکن جب صلوٰۃ کا لفظ استعمال کریں گے تو اس میں نماز بھی آجائے گی اور اس کے علاوہ اور مفہوم بھی۔ میں نے اکثر مقامات پر اس کی صراحت کر دی ہے کہ صلوٰۃ کا لفظ نماز کے اجتماعات کے لئے بھی قرآن کریم میں آیا ہے۔ مثلاً لغات القرآن میں لفظ صلوٰۃ (مادہ ص۔ل۔و (ی) کے تحت آپ کو یہ عبارت ملے گی۔

> صلوٰۃ کے جو مختلف مفاہیم اوپر بیان ہوئے ہیں ان سے ظاہر ہے کہ ایک عبد مومن، زندگی کے جس گوشے میں بھی قوانین خداوندی کے مطابق اپنے فرائض منصبی ادا کرتا ہے وہ فریضہ صلوٰۃ ہی کو ادا کر رہا ہوتا ہے۔ اس کے لئے وقت، مقام یا شکل کا تعین ضروری نہیں۔ لیکن قرآن کریم میں بعض مقامات ایسے بھی ہیں جہاں صلوٰۃ کا لفظ ایک خاص قسم کے عمل کے لئے استعمال کیا گیا ہے۔

اس کے بعد قرآن کریم کی وہ آیات دی گئی ہیں جن میں صلوٰۃ کا لفظ نماز کے لئے آیا ہے۔ اس کے بعد لکھا ہے۔

تصریحات بالا سے واضح ہے کہ قرآن کریم میں صلوٰۃ کا لفظ ان اجتماعات کے لئے بھی آیا ہے جنہیں عام طور پر نماز کے اجتماعات کہا جاتا ہے۔ (نماز کا لفظ عربی زبان کا نہیں۔ پہلوی زبان کا ہے)۔

اس کے بعد ارکان صلوٰۃ کی اہمیت کے سلسلے میں لکھا ہے۔

> انسان اپنے جذبات کا اظہار جسم کے اعضا کی محسوس حرکات سے بھی کرتا ہے اور یہ چیز اس میں ایسی راسخ ہو چکی ہے کہ اس سے یہ حرکات خود بخود سرزد ہوتی رہتی ہیں۔ غم وغصہ، خوشی، تعجب، عزم و ارادہ، ہاں اور نہ، وغیرہ قسم کے جذبات اور فیصلوں کا اظہار، انسان کی طبیعی حرکات سے بلا ساختہ ہوتا رہتا ہے۔ یہی کیفیت جذبات عزت واحترام اور اطاعت وانقیاد کے اظہار کی ہے۔ تعظیم کے لئے انسان کا سر بلا اختیار نیچے جھک جاتا ہے۔ اطاعت کے لئے ''سر تسلیم خم'' ہو جاتا ہے۔ اگرچہ قرآن کریم عمل کی روح اور حقیقت پر نگاہ رکھتا ہے اور محض (Formalism) کو کوئی وزن نہیں دیتا، لیکن جہاں کسی جذبہ کی روح اور حقیقت کے اظہار کے لئے (Form) کی ضرورت ہو، اس سے روکتا بھی نہیں۔ بشرطیکہ اس (Form) ہی کو مقصود بالذات نہ سمجھ لیا جائے۔ صلوٰۃ کے سلسلہ میں قیام و

سجدہ وغیرہ کی جو عملی شکل ہمارے سامنے آتی ہے وہ اسی مقصد کے لئے ہے۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ جب ان جذبات کا اظہار اجتماعی شکل میں ہوگا تو اظہار جذبات کی محسوس حرکات میں ہم آہنگی کا ہونا نہایت ضروری ہوتا ہے' ورنہ اجتماع میں انتشار ابھرتا دکھائی دے گا۔ احترام وعظمت' انقیاد و اطاعت اور فرماں پذیری وخود سپردگی کے والہانہ جذبات کے اظہار میں نظم وضبط کا ملحوظ رکھنا بجائے خویش بہت بڑی تربیت نفس ہے۔

مفہوم القرآن میں قرآنی اصطلاحات کے ضمن میں لکھا گیا ہے۔

قرآن کریم کی ایک خاص اصطلاح ''اقامت صلوٰۃ'' ہے جس کے عام معانی نماز قائم کرنا یا نماز پڑھنا کے ہیں۔ اس لئے صلوٰۃ میں' قوانین خداوندی کے اتباع کا مفہوم شامل ہوگا۔ بنا بریں اقامت صلوٰۃ سے مفہوم ہوگا ایسے نظام یا معاشرہ کا قیام جس میں قوانین خداوندی کا اتباع کیا جائے۔ یہ اس اصطلاح کا وسیع اور جامع مفہوم ہے۔ نماز کے اجتماعات میں قوانین خداوندی کے اتباع کا تصور' محسوس اور سمٹی ہوئی شکل میں سامنے آجاتا ہے۔ اس لئے قرآن کریم نے اس اصطلاح کو ان اجتماعات کے لئے بھی استعمال کیا ہے۔ قرآنی آیات پر تھوڑا سا تدبر کرنے سے واضح ہو جاتا ہے کہ کس مقام پر اقامت صلوٰۃ سے مراد اجتماعات نماز ہیں اور کس مقام پر قرآنی نظام یا معاشرہ کا قیام۔ مفہوم القرآن میں یہ معانی اپنے اپنے مقام پر واضح کر دیئے گئے ہیں۔

ان تصریحات سے واضح ہے کہ میں نے صلوٰۃ کے معنی نماز اور اقامت صلوٰۃ کے معنی اجتماعات صلوٰۃ کا قیام واضح الفاظ میں دیئے ہیں اور اس سے مراد وہی نماز ہے جسے ہم پڑھتے ہیں۔

(۳) ایک مقام پر نہیں' متعدد مقامات پر اور ایک مرتبہ نہیں' متعدد بار اس حقیقت کو واضح الفاظ میں بیان کیا جا چکا ہے کہ امت کے مختلف فرقے جس جس طریق سے نماز پڑھتے چلے آرہے ہیں ان میں کسی قسم کے ردوبدل کرنے کا حق کسی کو حاصل نہیں۔ اسی وجہ سے میں فرقہ اہل قرآن سے بھی اختلاف رکھتا ہوں جنہوں نے اپنے لئے الگ نماز تجویز کر رکھی ہے۔ البتہ میں یہ ضرور کہتا ہوں کہ اگر مسلمانوں میں پھر سے خلافت علیٰ منہاج نبوت کا قیام ہو جائے اور وہ تمام امت کے لئے نماز کی ایک ہی شکل تجویز کر دے تو یہ امت میں وحدت پیدا کرنے کے لئے بڑا موثر اقدام ہو گا۔ یہ تو ہمیں تسلیم کرنا پڑے گا کہ عہد رسالت مآب اور خلافت راشدہ میں' امت ایک ہی طریق پر نماز ادا کرتی ہو گی۔ اس وقت امت میں وحدت تھی۔ اس لئے جب ہم پھر

سے اسی عہد سعادت مہد کی طرف رخ کریں گے تو امت میں وحدت پیدا کرنے کی کوشش بھی ضرور کرنی ہوگی اور نماز اس کا بہت بڑا ذریعہ ہے لیکن اگر کوئی شخص یہ کہتا ہے کہ اب امت میں وحدت پیدا ہونے کا امکان ہی نہیں' تو میں اس سے بحث نہیں کرتا۔

(''طلوع اسلام'' نومبر و دسمبر ۱۹۶۱ء' ص ۱۲)۔

نماز کی اہمیت

میں نے ایسی باتیں بھی سنی ہیں کہ بعض اراکین بزم یہ کہتے ہیں کہ انہوں نے اب جو اسلام کو سمجھا ہے' اس کی بناء پر نماز پڑھنے کی ضرورت نہیں۔ میں پوچھتا ہوں کہ کیا ''طلوع اسلام'' نے آپ کو یہی تعلیم دی ہے کہ نماز نہ پڑھنے پر فخر کرو؟ آپ نے غیر قرآنی روش زندگی کو تو نہ چھوڑا' اور اس کے بجائے اس قسم کی باتیں کرنے لگ گئے اور ستم بالائے ستم کہ اپنے آپ کو طلوع اسلام کی تحریک سے وابستہ ظاہر کر کے ایسی باتیں کرنے لگے۔ طلوع اسلام پر آخر یہ کتنا بڑا الزام ہے جو آپ نے عائد کر دیا۔

ذاتی طور پر مجھ میں بھی کمزوریاں ہیں اور میں ہمیشہ اپنی کمزوریوں کا اعتراف کرتا ہوں۔ لیکن یہ انتہائی ظلم ہے کہ ہم اپنی کمزوریوں کے لئے جواز کی صورتیں تلاش کرنے لگ جائیں۔ آپ قرآنی نظریات کے خلاف سب کچھ کر رہے ہیں۔ تجارت' کاروبار' شادی' رشتے ناطے سب کچھ ہو رہا ہے۔ بینک بیلنس برابر قائم ہیں۔ قرآن کے مطابق انہیں بدلنے کے لئے آپ کے ذہن میں کبھی کچھ نہیں آیا۔ پھر نماز کے بارے میں ایسا کیوں ہے؟ (بعض گوشوں سے آوازیں آئیں کہ یہ بھی ہمارے مخالفین کا پروپیگنڈہ ہے جو طلوع اسلام کی تحریک سے وابستگی ظاہر کر کے اس قسم کی باتیں مشہور کرتے رہتے ہیں۔ محترم پرویز صاحب نے سلسلہ کلام کو جاری رکھتے ہوئے کہا) ہم معاشرے میں اصلاح کا آغاز اپنے گھروں سے ہی کر سکتے ہیں لیکن اگر پہلے خود ہی نماز روزہ چھوڑ دیں تو پھر اصلاح کس طرح ہو گی؟ خدارا اپنے قول و عمل کو بصیرت' علم اور خلوص پر مبنی رکھئے۔ ''مقدس بہانے'' تلاش نہ کیجئے بلکہ اعتراف کیجئے اپنی کمزوریوں کا۔ ہم نے قرآنی معاشرہ قائم کرنا ہے جو صرف نیک اور پاکباز زندگی بسر کرنے سے قائم ہو سکے گا۔

(منزل بہ منزل از پرویز' ص ۳۵-۳۶)

غلط فہمی کا ازالہ

ہماری ہر محفل میں الصلوٰۃ کا بحیثیت نظام جس طرح بار بار ذکر آتا ہے اس سے یہ غلط فہمی پیدا نہ ہونے پائے کہ ہم نماز کے وقت اجتماعات کی اہمیت کے قائل نہیں۔ .....صلوٰۃ کا وقتی اجتماع بھی قرآن ہی کا ارشاد ہے اور یہ الصلوٰۃ کے عالم آرا نظام ہی کی سمٹی ہوئی تصویر ہے۔ جو شخص نماز کی اہمیت کو کم کرتا ہے وہ طلوع اسلام کے خلاف فتنہ و شرارت کا محرک ہے اور ایسی مذموم حرکت کسی طرف سے نہ تو دانستہ ہونی چاہئے اور نہ نادانستہ۔ (ماہنامہ طلوع اسلام' مئی ۱۹۵۹ء ص ۱۴)

POLITICAL VALUE SYSTEM

By

Maj Gen (Rtd) Ihsan-ul-Haq

In this chapter, we will deal with

a) The setting up of institutions which would formulate rules to organize a society or government.

b) Procedure for election of people for such institutions.

c) Procedure for evolving the law.

The Quran offers clear guidance regarding the selection of people for these tasks

---

"Surely, Allah commands you to make over the administration of affairs of state to those worthy of such a task … " 4/58.

Merit alone is, therefore, the criteria for such appointments.

"Affairs of state are to be conducted in consultation among themselves…." 42/38.

Make this further clear that there are no hereditary or arbitrary appointments. Legislators and administrators at all levels are to be elected by the people themselves. As far as judging on merit is concerned, the Quran describes characteristic of a مومن (Momin), a firm believer in "Limits of Allah", in great details. These will be set out in a separate chapter. Muslims must measure candidates for office at all levels against Quranic description and make a selection of the best candidates.

The elected اولی الامر (those entrusted with the affairs of state) are, in turn, asked to enact legislation or administrative procedures in consultation with the people as enjoined in 42/38 in the paragraph above. Prophet Muhammad (pbuh) himself set a brilliant precedent in this sphere by consulting his people in all-important affairs.

"And consult them in formulation and enforcement of matters of state .." 3/159.

The Quran does not give the details or the form of such consultative institutions. It is for the Muslims themselves to evolve such institutions for themselves to suit their times and space so long as the principle of consultation is not lost sight of at any level.

"Limits of Allah" are clearly defined in the Quran but difference might well arise on smaller matters of detail when legislations is under discussion. At whatever level such differences arise the final arbiter should be the elected Chief Executive of the Islamic State.

"But, no, by the Lord (Rabb), they believe not until they make you a judge of what is in dispute between them and then find not any straitness in their hearts regarding your decision" 4/65.

Prophet Muhammad (pbuh) as Chief Executive, would, of course, make his final judgment in the light of what he would understand as a divine injunction. Later Chief Executives would certainly follow in the footsteps of the Holy Prophet and ensure that their arbitration would be according to their understanding of the "Limits of Allah"

"And, in whatever you differ, the final judgment thereof is with Allah…" 42/10.

Prophet Muhammad (pbuh) and the Chief Executives, who follow him, would represent Allah in such a situation.

It will be noticed that great stress has been laid upon the necessity of consultation among people whenever deciding upon matters of common interest. Institutions would, of course, be set up according to requirements of times. Local councils, district councils, provincial and federal parliaments would all be a part of general machinery of consultative procedure. The Quran, deliberately, does not go into the details of such organizations but does talk extensively of the principles governing consultative assemblies. Two very important pillars in this respect are

the institution of 'Salat' (Muslims' Regular Prayer) and 'Hajj' (Pilgrimage to Mecca)

I will discuss these institutions in greater detail later. Here only a brief introduction should suffice. Muslims all over the world assemble in their respective organizations at stated times to discuss problems facing them and find solutions.

"… Salat indeed has been enjoined on the believers at specified timings..." 4/103.

The primary aim of congregational prayers (صلوٰۃ) is for the Muslims to assemble for a particular mission. Frequency and exact timings of such gatherings have not been given in the Quran because these would depend on requirements of times and places. Such meetings may be daily, weekly, monthly and so on or on "as required basis". I may mention in passing that the Muslims have done injustice to the Quran by restricting (صلوٰۃ) to prayers alone. Salat has political, economic, social and other implications. In fact, it regulates all spheres of individual and collective lives of Muslims and enjoins them to follow the laws of God at all times. The fact that the primary aim of congregations was consultations among themselves is borne out by verse "42/38" in the Quran.

"… And who assemble for Salat and their affairs are decided by counsel among themselves…". 42/38

The day of assembly is further described in chapter 62 of the Quran.

"When the call is sounded for Salat on the day of assembly, hasten to the remembrance of Allah and leave off other business. That is better for you, if you know. But when the Salat is over, disperse abroad in the land and seek of Allah's grace." 62/9-10.

There is a particular point that the Quran has stressed in connection with attendance in such congregations.

"… go not near these assemblies when you are intoxicated, you must know exactly what you are talking about before you attend them…" 4/43.

Important matters are being discussed in these (صلوٰۃ) gatherings and it is important that people attending these sessions must be in full possession of their senses. This is another indication that Salat is not a mere ritual.

So much for assemblies at country and national levels. The Quran has suggested international gatherings of delegates of Muslims from all countries of the world at pre-arranged times and places so that leaders of Islam can agree upon Islam's response to international problems. Traditionally, حج (Hajj) has been an annual assembly and عمرہ (Umra) are occasional assemblies as required. Unfortunately, Hajj has been translated as pilgrimage, restricted to some ritual procedures and enjoined as a personal act of worship for individuals. I will not discuss these aspects here because we are talking about the primary aim of these international assemblies. A discussion of Hajj in great details follows in a separate chapter. The importance of such international gatherings is fully realized in modern times when scheduled meetings of the United Nations organization take place every year to plan for peace and prosperity of the globe. New York as a headquarters of such an organization has only recently come about but Mecca as a venue of international Muslim delegates assembly every year has been functioning for centuries. What is required for the organization of Islamic countries to hold their annual sessions in Mecca at international level. They must make their rules of procedures for modern times but must remember to include the few details mentioned in the Quran. A continuing tradition is a great binding force. The central organization would set up many smaller organizations based in different parts of the Islamic world who would hold their conferences or seminars etc. at specified times and places, عمرہ (Umra).

Elected Representatives اولی الامر at all levels must know that whenever they are legislating or making administrative plans, they must conform completely with Islamic higher values.

"Join the fold of Islam in toto. Do not get your guidance from your personal inclinations.." 2/208.

They must subordinate their own good to the good of fellow beings as enjoined by God. The ultimate sovereignty must rest in the Quran

"And whoever judges not by what Allah has revealed, those are the disbelievers" 5/44; also in 5/45 they are mentioned as:فاولئك هم الظالمون "Those are the Wrongdoers."

Some other nations may seem to be doing well while disobeying the laws of Allah. But that will only be for a short while. The consequences of their wrongdoing will soon be transparent.

"Is it then the judgment of ignorance that they desire? And who is better than Allah to judge for a people who have a firm belief. …" 5/50.

It would require courage on the part of legislators when they are asked to suppress their personal desires when legislating. They must not deviate from their main path – a total allegiance to Allah and His Prophet, howsoever, much a following of other courses of action may benefit them personally.

"…be not unfaithful to Allah and the Messenger nor unfaithful to your trusts…" 8/27.

When politicians in an Islamic state legislate in accordance with the wishes of Allah and also administer the affairs of state likewise, they will emerge as a major power in the comity of nations.

"Allah has promised to those of you who believe and do good that He will surely make them rulers in the earth as He made people like you before. He will establish for them their way of life, which He has chosen for them" …. 24/55.

They not only have the responsibility to ensure peace and prosperity in their own countries but also to help other struggling nations where justice is not being meted out to humanity. In such circumstances, they must ensure that they remain strictly

objective in the course of providing assistance and not maneuver a situation to their own advantage.

"And We have made you an exalted nation, equidistant from all other nations, keeping an eye on them for assistance to them while you yourselves must know that God and prophet keeps an eye over you (ensuring that you do not violate rules of decency)" 2/143.

We have already talked of an organization of Islamic countries when discussing Hajj. Here, the founding of a united nations organization is being hinted at. The more powerful and affluent nations of the world must make it a point to help developing nations to achieve their potential. If ever there is tension or war among nations, these exalted counties must intervene and ensure that human rights are not suppressed.

"And if two parties of the believers quarrel, make peace between them. Then, if one of them does wrong to the other, fight that which does wrong till it returns to Allah's command; then when it returns make peace between them with justice and act equitably,,," 49/9.

In international affairs, peaceful co-existence is very strongly enjoined in the Quran. Muslims must never force their view on other people when it comes to adoption of a way of life

"There is no compulsion in adoption of way of live …" 2/256.

"Say : O those of you who do not believe in the institution of divine permanent value system, I do not follow your ideology and you do not follow the value system I believe in. It appears that after a lot of thought and discussion, I am not likely to come over to your way of life nor are you likely to be persuaded to adopt mine. You are welcome to your belief. Allow me to stick to my value system. (Let there be a peaceful co-existence)" 109/1-6

In fact, when people of the world as a whole differ considerably in the way they think matters facing the world should be decided, they would be well advised to try and find a minimum common ground for peaceful resolution of issues. Let the differences not be emphasized. Start to work together with the values system they share.

"Say: O people who believe in rule of law (Ahlul Kitab), come let us find what we have in common in the sphere of a value system (Kalimaat)…" 3/64.

The UNO is trying to perform exactly this function in the formulation of a common approach to solve worldwide problems in an agreed way. Adoption of an international charter of fundamental, basic human rights is only one step in this direction. Success has been achieved in other spheres also and we must hope that people all over the world with different ideologies will all contribute to a minimum agreed upon programme and expand it in time.

Politics is the art of the possible. People will differ how they view problems in hand. They will also have different views on how to solve such problems. So long as these differences are in good faith and the aim on each side is the promotion of the best interests of a society, such differences must be taken in their stride. There should be no lasting enmities over honest differences of opinion. The Muslims are asked to hold fast to the divine value system and not have several different versions of a clearly defined guidance. Remaining within these "Limits of Allah", Muslims will differ in formulation of detailed legislation to suit their particular society in their times. This honest difference should not lead to enmity and the evolvement of a separate entity by each group.

"And hold fast by the covenant of Allah (Hablillah) all together and be not disunited. And, remember Allah's favour to you when you were enemies, then He united your hearts so by His favour you became brethrens. And, you were on the brink of a pit of fire, then He saved you from it …" 3/103

The legislators must not have a Sunni, Shia, Hanafi, Shafii, or Deobandi etc. approach. That will only create enmities. Legislators must refer ONLY to the Quran when arriving at a consensus. Only thus they have a chance of remaining united.

"As for those who split up on the evolvement of their way of life and became sects (following personalities), you have nothing in common with them…." 6/159

Differences on minor matters must be resolved by an agreed upon procedure. Detailed legislation will have to change with changing times and those who have frozen positions on such matters, ostensibly in following in the footsteps of personalities other than Allah, are not contributing towards creation of a united stand by the people. If they insist on creating schism, consequences will follow.

"And, obey Allah and His apostle and dispute not with each other lest you become weak hearted and your power departs…" 8/46.

****